مُدارسۃُ اخلاقِ الحکماءِ والعلماءِ مُحیی السُّنۃِ الحسنۃِ ومُمیتُ البدعۃِ

عقلاء و علماء کی سیرۃ کا مطالعہ خصائلِ حمیدہ کو زندہ اور اخلاقِ ذمیمہ کو مُردہ کرتا ہے (ابوریحان بیرونی)

تذکرۂ حالی

شمس العلماء مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

(کی)

لائف۔ تصنیفات اور عادات و اخلاق کا مختصر بیان

مؤلفہ

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

جلدِ اوّل

بتقریبِ جشنِ صد سالہ سالگرہ مولینا حالی مرحوم

پیش کردہ۔ حالی بک ڈپو۔ پانی پت

اکتوبر ۱۹۳۵ء | بارِ اوّل | قیمت فی جلد دو روپے

تمہید

جدید اُردو شاعری کے مجدّد اور حکیمانہ نظم کے موجد

"سعدیٔ ہند" شمس العلماء مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین حالی؎
پانی پتی کا نام ہندوستانی پبلک میں اب کسی تعارف کا محتاج
نہیں رہا۔ ہر کہ ومہ آپ سے واقف اور ہر چھوٹا بڑا آپ کی
پُرکیف نظموں کا دلدادہ ہے۔ مولانا نے زندگی کی جو تازہ رُوح
ہماری قدیم اُردو شاعری کے مُردہ اور بے جان جسم میں ڈالی
ہے اُس سے کوئی شخص بے خبر نہیں۔ اُردو نظم آپ سے پہلے
فحش شعروں۔ ناپاک واسوختوں۔ خرافات مثنویوں۔ گندگی
سے بھری ہوئی غزلوں۔ ہجر و وصال کے جھگڑوں۔ آسمان
کی شکایتوں۔ رقیب کی بُرائیوں۔ گل وبلبل کے تذکروں۔
کنگھی چوٹی کی داستانوں۔ عاشق کی وفاؤں۔ معشوق کی

کج ادائیوں - انتظار کی راتوں - فراق کی بیقراریوں اور واعظوں اور ناصحوں پر صلواتوں اور پھبتیوں سے بھری ہوئی تھی - اشعار کے اس انبارِ عظیم کی جو تعریف مولانا نے کی ہے۔ سُننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں ؎

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر　　عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر　　مَلک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہُوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہفت نظر علم انشا ہمارا

اِس شاعری پر مٹنے والوں اور اپنی زندگی اس فن کی نذر کر دینے والوں کے متعلق جو فتویٰ مولانا کا ہے وہ بھی سُن لیجئے ؎

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے　　عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے　　مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے

گنہگار وہاں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

اِس قسم کے شاعر دُنیا کے لیے کس قدر مفید ہو سکتے ہیں؟ یا اس شاعری سے دُنیا کو کس قدر فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اس کی نہایت دلچسپ تصویر مولانا اِن الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

زمانہ میں جتنے قُلی اور نفر ہیں کمائی سے اپنی وُہ سب بہرہ ور ہیں
گوئیے امیروں کے نُورِ نظر ہیں ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں

مگر اس تپِ دق میں جو مبتلا ہیں
خُدا جانے وُہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سقّے نہ ہوں - جی سے جائیں گزر سب ہو مَیلا جہاں - گُم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب جو ٹھُر جائیں جھتر - تو گندے ہوں گھر سب

پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

اس ٹائپ کے شعرائے "شیریں مقال" اور "فصاحت بیں مقبولِ پیر و جواں" بزرگ جو "بلاغت میں مشہور ہندوستاں ہیں" اُن کی شاعری کا مصرف اگر کچھ ہے تو صرف اتنا ؎

کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ اُن کی غزلیں مجالس میں گائیں

جو کام اُن کی شاعری اور اُن کے ضخیم غزلیات کے مجموعوں سے لیا جا رہا ہے یا اب تک لیا گیا ہے وہ یہ ہے ؎

طوائف کو از بر ہیں دیوان اُن کے
گویّوں پہ بیحد ہیں احسان اُن کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان اُن کے
ثنا خواں ہیں ابلیس و شیطان اُن کے
کہ عقلوں پہ پردے دیے ڈال اُنھوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال اُنھوں نے

غرض یہ حالت تھی اُس وقت ہماری شاعری کی۔ اور یہ کیفیت تھی ہمارے شاعروں کی۔ جبکہ مولانا شعرا کی اصلاح اور

شاعری کی تجدید کے لیے کھڑے ہُوئے۔ نہ شاعروں کی اصلاح آسان کام تھا۔ کیونکہ وُہ اپنے کو "تلامیذ الرحمٰن" سمجھتے تھے اور اُن کے خلاف ایک لفظ بھی کہنا بھڑوں کے چھتّے کو چھیڑنا تھا۔ نہ شاعری کی تجدید کوئی سہل بات تھی۔ کیونکہ قدیم ڈھچر پر اعتراض کرنا یا پُرانی ڈگر سے انحراف کرنا اتنا بڑا جُرم تھا۔ جو کبھی مُعاف نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس جرم کا مرتکب کشتنی اور گردن زدنی سمجھا جاتا تھا۔ مگر مولانا کی ہمّت اور جُرأت پر آفریں ہے کہ نہ اُنھوں نے تقلید کے پھندوں میں پھنسا رہنا گوارا کیا۔ نہ اعتراضوں کی پروا کی۔ نہ شخصیتوں سے مرعوب ہُوئے۔ بلکہ عزمِ راسخ کے ساتھ شاعری کی اصلاح اور تجدید میں مصروف ہو گئے۔ مولانا نے اپنی ان تھک کوششوں سے ہماری پست شاعری کو جس اَوجِ کمال پر پہنچایا اور جیسے خوشنما نقش و نگار اور دلفریب پھُول بُوٹے اُس میں بنائے اور

اُسے جس قدر اخلاقی - ناصحانہ - ادبی - فلسفیانہ اور نیچرل
سانچہ میں ڈھالا اُس کی تفصیلات باخبر اصحاب سے مخفی نہیں۔
آپ ہی کی زبردست مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ ہم آج اُردو
نظم کو اس حالت میں دیکھ رہے ہیں کہ بفضلِ خدا اُس میں
ہر قسم کا پاکیزہ لٹریچر مہیّا ہے۔ جس میں روز بروز اضافہ ہوتا
جا رہا ہے۔ روحانیات اور الٰہیات کے مسائل اس میں طے
کیے جاتے ہیں۔ اخلاقی مضامین اس میں پائے جاتے ہیں۔
اصلاحی اُمور اس میں بیان کیے جاتے ہیں۔ تاریخی واقعات
اس میں تحریر کیے جاتے ہیں۔ ادبی جواہر ریزے اس میں چمکتے
نظر آتے ہیں۔ مظاہرِ قدرت کا اس میں دلفریب تذکرہ ہوتا ہے۔
سائنٹیفک اور علمی مسئلے اس میں صادر کیے جاتے ہیں۔ غرض
جو شاعری محض حسن و عشق اور ہجر و وصل کے جھگڑوں میں
پھنس کر رہ گئی تھی۔ وہی شاعری حالی کی بدولت نہایت

حسن و نزاکت اور دلکشی و رعنائی کے ساتھ زبان و ادب اور
اخلاق و علم کی گراں بہا خدمت انجام دے رہی ہے۔
جدید شاعری کا یہ بانی۔ قومی، اخلاقی اور اصلاحی نظموں کا
یہ مجدّد۔ اور نظمِ اردو کا یہ بہترین نقاد اگر کسی زندہ قوم اور قدردان
ملک میں پیدا ہوتا تو ایک دو نہیں بیسیوں سوانح عمریاں
اُس کی لکھی جاتیں۔ سینکڑوں مضامین اُس کی شاعری، اُس
کی ادبی تنقید اور اُس کے اسلوبِ بیان کے متعلق ملک کے علمی
رسالوں میں تحریر کیے جاتے اور اُس کی تصنیفات کے ہزاروں
اعلیٰ سے اعلیٰ ایڈیشن ملک کے طول اور عرض میں شائع ہوتے۔
لیکن یہاں ہندوستان میں یہ حالت ہے کہ آج مولانا کے
انتقال کو پورے بیس برس گزر چکے ہیں، مگر اب تک نہ اُن
کے کلام کا کوئی مکمل مجموعہ شائع ہوا۔ نہ اُن کی تصنیفات کے
چھپنے کا کوئی معقول انتظام ہوا۔ اور نہ اُن کی کوئی مبسوط سوانح

عمری اس وقت تک لکھی گئی صرف چند اوراق کے دو تین چھوٹے چھوٹے رسالے البتّہ بطور سوانح عمری شائع ہوئے ہیں۔ مگر وُہ نہ جامع ہیں اور نہ مکمّل۔ بلکہ اُن میں سے بعض میں تو اس قدر مضحکہ خیز غلطیاں موجود ہیں کہ پڑھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے۔
مولانا حالی نہ صرف ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ بلکہ وُہ اعلیٰ درجہ کے ادیب۔ بہترین نقاد۔ بے مثل سوانح نویس اور زبردست مضمون نگار بھی تھے۔ لٹریری لحاظ سے اگر قطع نظر کر کے دیکھیں تو مولانا رہنمایانِ قوم اور مصلحین اقوام کی صفِ اوّل میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ وُہ قوم کے حقیقی بہی خواہ اور سچّے ہمدرد تھے۔ اور دل سے چاہتے تھے کہ کسی طرح تحت الثریٰ میں گری ہوئی قوم عروج و کمال کے انتہائی نقطہ تک پہنچ جائے۔ ذاتی طور پر دیکھیں تو مولانا ایسے منکسر المزاج۔ ایسے متواضع۔ ایسے مخیّر۔ ایسے ہمدرد خلائق۔ ایسے بے تعصّب۔ ایسے متحمل اور ایسے

بااخلاق اور متین و سنجیدہ بزرگ تھے کہ دورِ موجودہ کے لیڈروں میں سے ایک بھی ویسا نظر نہیں آتا۔ اِس مخصوص حیثیت میں وُہ یقیناً سلفِ صالحین کی یادگار اور اُن کی ایک زندہ مثال ہمارے سامنے تھے۔

بیان کردہ اِن مختلف حیثیات پر نظر کرتے ہُوئے کیا لازم نہیں آتا کہ ہم حالی کی شخصیّت اور سوانح حیات کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تاکہ ہم پر منکشف ہو جائے کہ وُہ کس عظمت و شان کا انسان تھا اور کس طرح وُہ اس اُونچے درجہ پر پہنچا؟ حالی کی زندگی ہمیں بہت سے بیش بہا سبق دیتی ہے اور ہم میں سے خوش قسمت ہیں وُہ لوگ جو اس سے سبق حاصل کر کے اپنی زندگی کو ویسا ہی بنانے کی کوشش کریں۔

اسی خیال کے پیشِ نظر ۱۹۱۴ء سے جب کہ مولانا کا انتقال ہُوا۔ مَیں مولانا کے حالات اور واقعاتِ زندگی جمع کر

رہا ہوں۔ اُن کی نایاب اور ناپید تصانیف انتہائی جستجو
کے ساتھ فراہم کر رہا ہوں۔ اُن کے پراگندہ اور منتفرق مضامین
اخبارات و رسائل کے پرانے اور قدیم فائلوں میں سے ڈھونڈ
رہا ہوں۔ اُن کی غیر مطبوعہ نظمیں اور قلمی تحریریں تلاش کر رہا
ہوں۔ اُن کے قابلِ قدر پرائیویٹ خطوط بڑی جانکاہی سے
سے اکھٹے کر رہا ہوں۔ غرض حالی کے متعلق جو کچھ بھی کہیں
سے ملتا ہے، حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ابھی میں مولانا کے حالاتِ زندگی کی جمع اور ترتیب میں
مصروف ہی تھا کہ مولانا مرحوم کے گرامی قدر فرزند رشید مخدومی
جناب خواجہ سجّاد حسین صاحب پنشنر انسپکٹر مدارس سررشتۂ
تعلیم پنجاب نے اپنے قابلِ فخر باپ کی ولادت کی صد سالہ سالگرہ
ایک عظیم الشان ادبی جشن کی صورت میں منانے کا ارادہ
کیا۔ اس مبارک موقع پر ضرور تھا کہ مولانا کے مفصّل سوانحی

حالات اور آپ کے بے نظیر علمی کارنامے نہایت تفصیل
اور تشریح کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کئے جاتے۔
لیکن نہ وُہ سب اس وقت مرتّب ہیں اور نہ ایک دو ماہ کی
مُدّت میں مدوّن ہو سکتے ہیں۔ برسوں محنت کی جائے۔ تب
کہیں جاکر دس بارہ ضخیم جلدوں میں دورِ حاضرہ کے اس قادر
الکلام شاعر اور بے مثل ادیب کے واقعاتِ حیات قلمبند ہوں
اور آپ کے اعلیٰ علمی کارناموں پر کچھ روشنی پڑ سکے۔
مگر باوجود اس مجبوری کے اشد ضرورت تھی کہ اِس
مہتم بالشان تقریب پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور شائع کیا جائے۔ اس
لیے یہی مناسب معلوم ہُوا کہ بہت ہی اختصار کے ساتھ مولانا
کے نہایت جستہ جستہ حالات زندگی کا ایک مختصر مجموعہ ناظرین
کے سامنے پیش کیا جائے۔ مگر وہ مجموعہ ایسا ہو کہ اس وقت
کے تمام شائع شدہ تذکروں سے بمراتب بہتر اور فائق ہو اور

اس کے مطالعہ کے بعد حالی کی عظیم الشان شخصیت کے متعلق قارئین کرام کو بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوں جو اب تک عام طور پر معلوم نہیں۔

اِس خیال کی عملی شکل یہ چھوٹی سی خوبصورت کتاب ہے، جو میں اس علمی جشن کی یادگار کے طور پر اربابِ علم کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس میں واقعات و حالات اگرچہ انتہائی طور پر مختصر بیان کیے گئے ہیں، مگر میں نے کوشش کی ہے کہ اوّل تو کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب بیان کروں۔ دُوسرے جو کچھ لکھا جائے وُہ نہایت ہی مستند ذرائع سے حاصل شدہ ہو اور اُس وقت تک اہلِ ذوق حضرات کی رہنمائی کر سکے۔ جب تک مولانا کی مفصّل سوانح عُمری تیار ہو۔ اگر سچ پُوچھیں تو یہ اَوراق مولانا کی مفصّل سوانح عُمری کا نچوڑ اَور عطر ہیں۔ کیونکہ تمام ضروری باتیں مَیں نے احتیاط

کے ساتھ اخذ کر کے اس چھوٹے سے مضمون میں ٹھونس ٹھونس کر بھر دی ہیں۔

میں نہایت شکر گزار ہوں گا اُن اصحاب کا جنہوں نے مولانا کو دیکھا ہے یا آپ کی صحبت اُٹھائی ہے۔ اگر وہ کوئی واقعہ مولانا کے اخلاق یا سیرت کے متعلق مجھے لکھ کر بھیجدیں گے یا مولانا کی کسی ایسی نظم یا مضمون کا پتہ دینگے جو غیر مطبوعہ یا نایاب ہو۔ تاکہ یہ سب چیزیں مولانا کی مفصّل سوانح عُمری لکھنے میں کام آسکیں۔

اس تمہید کے بعد جو کسی قدر طویل ہوگئی۔ میں اصل مضمون شروع کرتا ہوں۔

مورّخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء خاکسار محمد اسمٰعیل پانی پتی

تذکرہ
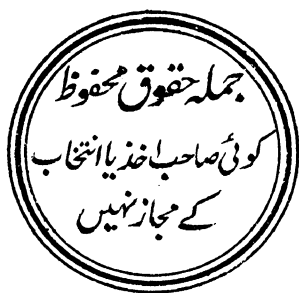
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابِ اوّل

مولانا کا نام و نسب اور خاندان

والد اور والدہ کی طرف سے مولانا کا شجرۂ نسب

آج اس بات کو پورے سَو برس گزر چکے ہیں جب کہ شمالی ہند کے مشہور تاریخی شہر پانی پت میں نظمِ اُردو کا بہترین نقاد، جدید اور نیچرل شاعری کا بانی۔ اور قومی، اصلاحی اور اخلاقی نظموں کا زبردست مجدّد پیدا ہُوا۔ والدین نے الطاف حسینؒ نام رکھّا۔ یہی وُہ بچّہ ہے، جو بڑا ہو کر شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسینؒ حالی کے نام سے دُنیا میں مشہور ہُوا۔

مولانا والدہ کی طرف سے سیّد ہیں اور والد کی جانب سے انصاریوں کی اُس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں، جو مشہور اور جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایّوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہے۔ مولانا کے دونوں شجرے یہاں درج کئے جاتے ہیں، جو نہایت تلاش سے فراہم کیے گئے ہیں۔

والد کی طرف سے شجرۂ نسب

مولانا[1] الطاف حسین حالی بن خواجہ[2] ایزد بخش بن خواجہ[3] بو علی بخش بن خواجہ[4] محمد بخش بن خواجہ[5] غلام محمد بن خواجہ[6] عبد السبحان بن خواجہ[7] عبد الکریم بن خواجہ[8] مسلم بن خواجہ[9] زین الدین احمد بن خواجہ[10] عبد الکافی بن خواجہ[11] ضیاءُ الدین بن خواجہ[12] ابو راشد بن خواجہ[13] ابو حامد بن خواجہ[14] ابو تُراب بن خواجہ[15] نصیر الدین محمود بن قاضی[16] خواجہ ملک علی بن خواجہ[17] میرک علی شاہ بن خواجہ[18] مسعود بن خواجہ[19] عمر

بن خواجہ[۲۰] ابراہیم بن خواجہ[۲۱] عثمان بن خواجہ[۲۲] ابوطاہر بن خواجہ[۲۳] عنقہ بن خواجہ[۲۴] انفع بن شیخ[۲۵] نافع بن خواجہ[۲۶] ملک شرف الدین امیر محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجہ بن خواجہ[۲۷] محمد الملقب بہ امیر شیخ ابواسحٰق بن خواجہ[۲۸] فضل اللہ بن خواجہ[۲۹] عبداللہ بن اسعد[۳۰] انصاری بن شیخ[۳۱] محمد (ثانی) بن شیخ[۳۲] نصیر بن شیخ[۳۳] محمد (اوّل) بن شیخ[۳۴] الاسلام ابواسمٰعیل خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات بن ابوالمنصور[۳۵] محمد بن ابی معاذ[۳۶] انصاری بن محمد[۳۷] انصاری بن احمد[۳۸] انصاری بن علی[۳۹] انصاری بن جعفر[۴۰] انصاری بن ابومنصور[۴۱] مت الانصاری بن حضرت خالد ابوایوب انصاری خزرجی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

شجرۂ نسب والدہ کی طرف سے

مولانا[۱] الطاف حسین حالی بن امۃ[۲] الرسول (زوجہ خواجہ ایزد بخش) بنت سید[۳] محمد شفیع بن سید[۴] محمد امین بن سید[۵] عبدالرحمٰن بن سید[۶] عبدالرحیم بن سید[۷]

ابو القاسم بن سید[8] علی بن سید[9] منجھو بن سید[10] محمد بن سید[11] امجد بن سید[12] نعمت اللہ بن سید[13] اخوند بن سید[14] حسام الدین بن سید[15] شمس الدین بن سید[16] معظم بن سید[17] مرتضیٰ بن سید[18] نور الدین بن سید[19] مغیث بن سید[20] محمد بن سید[21] موسیٰ بن سید[22] ابی تمیم بن سید[23] یحییٰ بن سید[24] ابراہیم بن سید[25] موسیٰ مکحول بن سید[26] ابو جعفر بن حضرت سید[27] اسماعیل شہید بن حضرت[28] سید احمد بن حضرت[29] امام ابو القاسم اسماعیل شہید شہدا پوری بن حضرت[30] سید محمد ناطق بن حضرت[31] اسماعیل ناطق بن حضرت[32] امام جعفر صادق رض بن حضرت[33] امام ابو جعفر محمد باقر رض بن حضرت[34] امام علی زین العابدین رض بن حضرت[35] سیدنا امام حسین رض بن حضرت[36] سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت خاتم[37] الانبیاء افضل الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔

آبا و اجداد

حضرت ابوایوب انصاری۔ حضرت ابومنصور مت الانصاری۔ شیخ الاسلام
خواجہ عبداللہ انصاری۔ ملک محمود شاہ انجو۔ خواجہ میرک علی شاہ۔
قاضی خواجہ ملک علی انصاری

جیساکہ بیان ہوچکا ہے مولانا حضرت خواجہ ابوایوب انصاریؓ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد میں سے اکثر بزرگ نہایت نامور اور مشہور ہوئے ہیں۔ چند کا نہایت مختصر تذکرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

حضرت ابوایوب انصاری

آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ جب

حضورؐ نے مکّہ معظّمہ سے مدینہ منوّرہ کو ہجرت فرمائی ہے۔ تو یثرب پہنچ کر سب سے اوّل جس خوش قسمت انسان کو آنحضرتؐ کی میزبانی کا شرف حاصل ہُوا وُہ حضرت ابوایّوب ہی تھے۔ جب تک مسجدِ نبویؐ اور اہلِ بیت اطہار کے لیے حجرے نہ بن لیے آنحضورؐ آپ ہی کے مکان میں قیام پذیر رہے۔ دراصل یہ کوئی تھوڑا شرف نہیں ہے جو تمام انصار کے مقابلہ میں حضرت ابوایوبؓ کو حاصل ہُوا۔ تمام صحابہؓ اسی شرف کی وجہ سے آپ کی نہایت تعظیم کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنے زمانہ خلافت میں آپ کا وظیفہ پانچ ہزار سے بڑھا کر بیس۲۰ ہزار کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں چالیس غلام اُن کا کاروبار کرنے کے لیے اُن کو مرحمت فرمائے تھے۔

سنہ ۵۲ھ میں آپ ایک لشکر میں شامل ہو کر شام میں جہاد کے لیے گئے۔ لشکر کا امیر یزید بن حضرت معاویہؓ تھا مگر ابھی راستے ہی میں تھے کہ آپ ایسے شدید بیمار ہو گئے کہ زندگی

کی آس نہ رہی۔ یزید عیادت کے لیے آیا تو آپؓ نے اُسے وصیّت کی کہ " اگر مَیں مر جاؤں تو میرے جنازہ کو لے کر مع فوج کے روانہ ہونا۔ اور کفّار کی سر زمین میں جہاں تک جانا تمھارے لیے ممکن ہو سکے چلے جانا۔ جب دیکھو کہ آگے بڑھنا بالکل ناممکن ہے تو وہیں مجھے دفن کر دینا اور لوٹ آنا"۔ اِس بوڑھے صحابیٔ رسولؐ کی ہمّت، اولوالعزمی اور بلند خیالی پر غور کرو۔ کہ کتنی عجیب و غریب ہے۔ اس وصیّت سے اُن کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس جوش میں فوج برابر آگے بڑھتی جائیگی اور دشمن کا ملک فتح ہوتا جائیگا۔ کتنا پاک جذبہ اور کتنا بہادرانہ خیال تھا۔ سچ ہے ؎

حق کو ہوتا ہے جنھیں دُنیا میں کرنا سربلند
خصلتیں یہ برگزیدہ اُن کو ہوتی ہیں عطا

یزید نے اس مقدّس وصیّت کی پُوری پُوری تعمیل کی۔

جب اس جلیل القدر صحابی کا انتقال ہوگیا، تو یزید نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ جنازہ آگے آگے اور فوج پیچھے پیچھے لڑتی بھڑتی روانہ ہوئی۔ یہاں تک بالکل قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے جنازہ پہنچ گیا۔ آگے راستہ کہاں تھا۔ پس یزید نے جنازہ وہیں دفن کر دیا۔ اور شاہِ قسطنطنیہ سے کہلا بھیجا کہ ہم نے اپنے ایک محترم بزرگ کو یہاں دفن کیا ہے۔ اگر تم نے دشمنی میں آکر اُن کے مزار کی بے حرمتی کا ارادہ کیا، تو یاد رکھنا کہ شام میں عیسائیوں کے جس قدر گرجا ہیں، فوراً سب کے سب زمین کے برابر کرا دوں گا۔

یہی خوف تھا جس کے باعث حضرت ابو ایوبؓ کا مزار باوجود غیر سلطنت اور دشمن کے ملک میں ہونے کے ہمیشہ محفوظ رہا۔ جب ۱۲۵۳ء میں سلطان محمدؒ فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اُس نے آپ کے مزار کو پختہ اور

عظیم الشان بنوا دیا۔ اور وہ آج تک زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ ترکی کے تمام سلاطینِ عثمانیہ کی رسم تاجپوشی آپ ہی کے پُرانوار مزار پر عمل میں آتی رہی ہے۔

حضرت ابو منصور مت الانصاری

یہ حضرت ابو ایوبؓ کے لڑکے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک مہم حضرت احنف بن قیسؓ صحابی کی زیر سرکردگی خراسان بھیجی تھی۔ حضرت ابو منصور اس فوج میں شامل ہو کر مدینہ سے گئے تھے۔ خراسان پہنچ کر آپ نے بمقام ہرات مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور پھر واپس مدینہ نہ آئے۔ آپ نے اپنی شادی بھی ہرات میں کی تھی اور غالباً یہی تعلق وہاں مستقل قیام کا باعث ہوا۔

شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری

حضرت ابو ایوبؓ کی اولاد میں یہ بزرگ نہایت زبردست

عالم اور بے عدیل فاضل گزرے ہیں۔ تمام متقدمین اُن کی بزرگی علم اور زہد و تقویٰ اور پاکیزگی و پرہیزگاری کے قائل ہیں۔ فنِ حدیث کے بہت بڑے امام اور صوفیٔ کامل تھے۔ اُن کے فضائل و مناقب سے کتبِ تصوّف و سِیَر بھری پڑی ہیں۔ بہت سی کتب کے مصنف۔ بڑے ادیب اور اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے۔ ۸۵ سال کی عمر میں ۹ ربیع الاوّل ۴۸۱ھ کو ہرات میں وفات پائی۔ علمائے فرنگی محل لکھنؤ آپ ہی کی اولاد سے ہیں۔

ملک شرف الدین محمود

خواجہ ملک شرف الدین امیر محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجہ غزنوی دور میں فارس و کرمان اور عراق عجم کا فرمانروا تھا۔ سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی کے ہاتھ سے شکست کھا کر ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ انجو فارسی میں

امیر سامان کو کہتے ہیں اور زنڑ کی ہیں موتیوں کو۔

میرک علی شاہ

ہرات کا فرمانروا۔ اور نہایت دلیر۔ شجاع۔ عقلمند۔ علم دوست اور علماء کا قدر دان تھا۔ ۶۷۳ھ میں انتقال کیا۔

خواجہ ملک علی

نہ معلوم کیا وجوہات ہوئیں کہ اپنے باپ میرک علی شاہ فرمانروائے ہرات کے انتقال کے بعد خواجہ ملک علی ہرات چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ہندوستان چلے آئے۔ مولانا حالی کے آباؤ اجداد میں یہ سب سے پہلے شخص ہیں جو ہندوستان آئے ہیں۔ چنانچہ مولانا ان کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تختِ دہلی پر متمکن تھا۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیرِ ہرات کی اولاد میں سے ایک

بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وُہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزّت کرتا ہے اور اُس کا بیٹا سلطان محمدؐ علماء و شعراء اور دیگر اہلِ کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا۔ اس لیے اکثر اہلِ علم اور خاندانی لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفرِ ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند[۱] عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ[۲] اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش اور بہت[۳] سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے اُن کو عنایت کی اور منصب قضا[۱] و صدارت[۲] و تشخیص[۳] نرخ بازار اور تولیت[۴] بازارِ ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں۔

اور خطابتِ عیدین اُن کے متعلق کر دی۔ پانی پت میں اب تک جو ایک محلّہ انصاریوں کا مشہور رہے۔ وُہ اُنہی بزرگ کی اَولاد سے منسوب ہے۔"

خواجہ ملک علی انصاری ۶۷۵ھ مطابق ۱۲۷۶ء میں مع اپنے دو بیٹوں خواجہ محمد مسعود اور خواجہ محمد نصیر الدّین کے پانی پت میں وارد ہُوئے تھے۔ اُس وقت پانی پت علماء اور فضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا اور علم و تصوّف کے دریا یہاں لہریں مار رہے تھے۔ خواجہ ملک علی نے جو یہ علمی صحبتیں اور مذہبی چرچے دیکھے تو یہیں رہ پڑے اَور ایسے رہے کہ آپ کی اَولاد آج تک یہیں آباد ہے اور بڑے بڑے معزز اور نامور بزرگ اُن میں ہو چکے ہیں۔

باب سوم

ولادت - پرورش اور تعلیم

جائے ولادت - والدین - بھائی بہنیں - پرورش - حفظِ قرآن - فارسی کی تعلیم - عربی کی تدریس - شادی - بیوی کا میکا - تعلیم کا شوق دہلی لے گیا - حصولِ علم کے مصائب - دہلی کے اساتذہ - مولوی نوازش علی - مولوی فیض الحسن - مولوی امیر احمد - میاں نذیر حسین - مرزا غالب - انگریزی نہ پڑھ سکنے کی وجوہات - دلّی سے جبری واپسی - دلّی سے واپسی کے بعد - ملازمت - ۱۸۵۷ء کا غدر اور ملازمت کا چھوٹ جانا - ایامِ بیکاری میں تحصیل علم -

جائے ولادت خواجہ ملک علی انصاری - پانی پت کے جس محلہ میں آکر مقیم ہوئے تھے اور جہاں اُن کی اولاد نے اپنی بود و باش کیلئے

مکانات بنائے۔ وہ محلّہ اُن کے نام کی مناسبت سے "محلّہ انصار" کہلانے لگا اور آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ وہ مکان جس میں خواجہ ملک علی رہتے تھے۔ آج کل راقم الحروف کے ایک عزیز شیخ شمس الدین صاحب کی ملکیّت ہے۔ اس گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر بجانبِ جنوب نواب ممتاز حسینؒ کے امام باڑہ سے بالکل ملحق وہ مکان ہے جہاں مولانا الطاف حسینؒ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مکان اُن کے برادرِ کلاں کا تھا اور آجکل اس میں مولانا کے پوتے خواجہ اکرام حسینؒ مرحوم کی بیوہ مع اپنے بچّوں کے رہتی ہیں۔ اس مکان کے حدودِ اربعہ مندرجہ ذیل ہیں۔ جانبِ شمال امام باڑہ۔ جانبِ شرق خاکسار راقمِ تذکرۂ ہٰذا کا مکان اور مغرب و جنوب کی سمت شارع عام۔

ولادت اور والدین جناب مولانا اسی محلّہ اور اسی مکان میں ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے

مولانا کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا اور وہ سرکارِ انگریزی کے سررشتہ پرمٹ میں ایک معمولی ملازم تھے۔ والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی بیٹی تھیں جو "ساداتِ شہداپور" کے نام سے مشہور ہے اور اُن کا نام امّت الرسول عرف بی چھولو تھا۔

بھائی بہنیں | مولانا کے ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ مولانا ان تینوں سے چھوٹے تھے۔ بھائی کا نام خواجہ امداد حسین تھا وہ یوپی میں انسپکٹر پولیس تھے۔ فارسی کے اچھّے شاعر اور نہایت با مذاق اور زندہ دل شخص تھے۔ مظہر تخلص کرتے تھے۔ دو بہنوں میں سے بڑی کا نام اَمۃ الحسین تھا۔ وہ حکیم خواجہ محمد علی کی بیوی تھیں۔ حکیم محمد علی، خان بہادر خواجہ تصدق حسین مرحوم ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج کے والد تھے۔ دوسری بہن کا نام وجیہہ النساء تھا اور وہ سیّد محمد حسین کی زوجہ تھیں۔ اُن کی لڑکی

اُم الحسن اُستاذی جناب مولانا خواجہ غلام الحسنین صاحب
سابق انسپکٹر تعلیمات صوبہ گلبرگہ و مترجم فلسفہ تعلیم ہربرٹ
سپنسر اور آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم ایڈیٹر عصرِ جدید کی
والدہ تھیں۔ جن کے لڑکے خواجہ غلام السیدین صاحب بی۔ اے
ایم۔ ای۔ ڈی آجکل مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں ٹریننگ کالج
کے پرنسپل ہیں۔
پرورش مولانا کی پیدائش کے بعد بعض خانگی تفکّرات کی وجہ
سے آپ کی والدہ صاحبہ کی حالت کچھ ایسی ہوگئی کہ ہر وقت
ایک استغراق کے عالم میں رہتیں اور بہت کم بولتی تھیں۔
والد صاحب نوکری پر تھے۔ بچّے کی دیکھ بھال اور پرورش
کون کرتا۔ ہزار آفریں ہے بھائی بہنوں کو کہ اُنھوں نے
الطاف حسین کو بھائی نہیں اپنی اولاد سمجھا اور نہایت محبّت
کے ساتھ اُن کی پرورش اور نگہداشت کی۔ ابھی آپ کی عُمر

نو برس کی ہی ہوئی تھی کہ ۱۸۴۵ء میں آپ کے والد خواجہ ایزد بخش کا چالیس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ مولانا کو والد کے انتقال کا قدرتاً سخت صدمہ ہوا۔ مگر ایک بے یار و مددگار بچہ کیا کر سکتا تھا۔ اب آپ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بار کلیتہً بھائی بہنوں پر پڑ گیا۔

حفظِ قرآن پاک | جب مولانا کی عمر چار پانچ برس کی ہوئی تو بھائی نے آپ کو پڑھنے بٹھا دیا۔ اُس زمانہ میں پانی پت میں دستور تھا کہ شرفا کے بچے قرآن شریف لازمی طور پر حفظ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کو بھی محلہ کے ایک نہایت جیّد قاری اور بہترین حافظ کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ زمانہ کے دستور کے موافق قرآن شریف حفظ کریں۔ اِن قاری صاحب کا نام حافظ ممتاز علی انصاری تھا اور تمام معزز انصاریوں کے لڑکے انہی سے قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ حافظ صاحب طلبہ کو اپنے مکان ہی

پرورش دیا کرتے تھے ۔ یہ مکان محلہ انصار میں خواجہ محمد صادق صاحب انصاری کے مکان کے سامنے واقع اور خاکسار راقم کے ایک عزیز شیخ محمد محسن صاحب کی ملکیت ہے۔

مولانا کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا اور پڑھنے کا شوق بھی آپ کو بے حد تھا۔ اس لیے نہایت جلد آپ نے قرآنِ مجید حفظ کر لیا۔

آپ بچپن میں قرآنِ مجید ایسی خوش آوازی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پڑھتے تھے کہ جو شخص بھی سنتا تعریف کرتا۔ چنانچہ مخدومی جناب خواجہ سجاد حسین صاحب (خلف الرشید مولانا مرحوم) نے ایک دن مجھ سے ذکر کیا کہ "ایک مرتبہ قاری لالا نے (جو پانی پت کے عدیم النظیر قاری اور حافظ تھے) والدِ مرحوم کا قرآن بچپن میں سنا تو فرمایا "یہ نہایت جوہرِ قابل معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تربیت بڑی اچھی طرح کی جائے"۔

فارسی کی تعلیم جب ختم قرآن سے فراغت ہوئی تو بھائی نے آپ کو ایک صاحب سید جعفر علی نامی کے پاس فارسی تعلیم کے لیے بٹھا دیا۔ یہ صاحب بھی محلہ انصار ہی میں رہتے تھے اور میر ممنون دہلوی کے بھتیجے نیز داماد تھے۔ اگرچہ اُن کا اصلی وطن سونی پت تھا۔ مگر سسرال کے تعلق سے پانی پت میں مقیم تھے۔ یہ صاحب فارسی زبان کے بہت اچھے ادیب اور بڑے سخن فہم بزرگ تھے۔ تاریخ اور طب میں بھی معقول دستگاہ رکھتے تھے۔ مولانا نے ان سے فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ چونکہ دماغ نہایت سُلجھا ہُوا اور حافظہ بڑا قوی تھا۔ چند ہی روز میں بہت اچھی لیاقت فارسی کی حاصل کر لی اور فارسی لٹریچر سے بہت گہری دلچسپی آپ کو اُسی وقت سے پیدا ہو گئی۔

عربی کی تدریس ابھی آپ فارسی پڑھ ہی رہے تھے کہ عربی کا شوق

پیدا ہوا۔ اتفاقاً اُنہی ایّام میں مولانا کی برادری میں سے ایک
بزرگ مولوی حاجی ابراہیم حسین صاحب انصاری لکھنؤ سے عربی
علوم تحصیل کرنے کے بعد امامت کی سند لے کر آئے تھے۔ اور
پانی پت میں مقیم تھے۔ مولانا نے اُن سے عربی کی کچھ معمولی اور
ابتدائی کتابیں اور تھوڑی سی صرف و نحو پڑھی۔

شادی | ابھی مولانا نہایت شوق اور انہماک کے ساتھ اپنی
تعلیم میں مصروف تھے کہ بھائی بہن کو اُن کی شادی کا خیال
آیا۔ آپ کی اپنی مرضی اس وقت شادی کی بالکل نہیں تھی۔
کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ شادی ہونے کے بعد میری تعلیم
رُک جائیگی۔ لیکن ایک سعادتمند بچّے کی مانند آپ بھائی بہن
کا بیحد ادب کیا کرتے تھے۔ کیونکہ بزرگ بھائی بہن ہونے کے
علاوہ اُنہوں نے والدین کی طرح اِنہیں پرورش بھی کیا تھا اور
اسی وجہ سے اپنی مرضی نہ ہونے پر بھی مولانا بھائی بہن

کے سامنے فرطِ ادب سے کچھ بول نہ سکے اور اُنہوں نے دھوم دھام کے ساتھ آپ کی شادی کر دی۔ اُس وقت آپ کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔

بیوی کا میکا مولانا کی شادی بھائی نے سادات کے ایک نہایت معزز گھرانے ہیں کی تھی۔ آپ کی اہلیہ کا نام اسلام النساء تھا اور وہ سیّد باقر علی نام ایک بزرگ کی صاحبزادی تھیں۔ دنیوی لحاظ سے بھی مولانا کی سُسرال والے اچھے کھاتے پیتے اور آسودہ حال لوگ تھے۔

تعلیم کا شوق دہلی لے گیا شادی کے بعد اس خاموش اور سنجیدہ طالب علم کو جسے قدرت نے علم حاصل کرنے اور علوم کی اشاعت کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ عزیز و اقربا نے مجبور کرنا شروع کیا کہ "بس میاں بہت پڑھ چکے اور کہاں تک پڑھو گے؟ اب لکھنا پڑھنا ختم کرو۔ کہیں نوکری تلاش کرو۔ خود کھاؤ بیوی

کو کھلاؤ" مگر یہاں کون سُنتا تھا۔ یہاں تو دُھن ہی اور سوار تھی۔ لیکن جب لوگوں نے بہت ہی زور ڈالا اور ہر طرف سے بھی تقاضے ہونے لگے تو آخر تنگ آکر ایک روز جبکہ بیوی میکے میں گئی ہوئی تھی مولانا بغیر کچھ سامان یا بستر لیئے نہایت خاموشی کے ساتھ بلا کسی سے کچھ کہے سُنے گھر سے نکل کھڑے ہُوئے اور پیدل یا کسی اُونٹ گاڑی میں دہلی روانہ ہو گئے۔ جو اُس وقت علم کا مرکز اور اہلِ علم کا ملجا و ماوٰی بنی ہوئی تھی۔ یہ ۱۸۵۲ء کا ذکر ہے۔ اُس وقت تک ریل ایجاد نہ ہوئی تھی اور لوگ پیدل ہی یا اُونٹ گاڑیوں یا بیل گاڑیوں میں سفر کیا کرتے تھے۔

حصولِ علم کے مصائب اُس زمانہ میں دہلی میں جامع مسجد کے قریب حسین بخش کا مدرسہ نیا نیا قائم ہُوا تھا۔ مشہور و معروف فاضل اور واعظ مولوی نوازش علی اس میں درس دیا کرتے تھے

مولانا بھی حسین بخش کے مدرسہ میں پہنچے اور وہاں داخل ہو گئے۔ نہ پیسہ پاس تھا۔ نہ کچھ سامان ساتھ تھا۔ نہ معلوم کن مصائب اور مشکلات میں اس عاشقِ علم نے یہ کٹھن دن کاٹے اور کس طرح کاٹے۔ مخدومی خواجہ سجاد حسین صاحب ایک مرتبہ یہ بیان کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے کہ "زمانۂ قیام دہلی میں والدِ مرحوم تکیے کی جگہ ایک یا دو اینٹیں سرہانے رکھ لیا کرتے تھے اور اُنہی پر سر رکھ کر سو جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے دن اُن پر ایسے بھی گزرے ہوں گے کہ فاقہ رہا ہوگا اور کھانے کو کچھ نہ مل سکا ہوگا۔ اس محنت اور تکلیف کا نتیجہ تھا کہ والدِ مرحوم کی صحت جوانی ہی میں خراب ہو گئی اور ہمیشہ بیمار رہنے لگے"۔

دہلی کے اساتذہ
۱۔ مولوی نوازش علی

مولانا نے دہلی پہنچ کر سب سے اوّل مولوی نوازش علی سے عربی کی تکمیل شروع کی۔ جتنی کمی پانی پت میں صرف و نحو

کی تکمیل میں رہ گئی تھی وہ پوری کی اور منطق کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ شرح سلّم۔ مُلّا حسن اور میبذی وغیرہ کتب اُس وقت درسیات میں شامل تھیں اور یہی مولانا نے شروع کیں۔ مولوی نوازش علی موضع ہابڑی (تحصیل کیتھل ضلع کرنال) کے رہنے والے بڑے زبردست واعظ۔ متبحر فاضل اور مشہور مدرس تھے۔ سرسیّد نے بھی ان سے پڑھا ہے۔

۲۔ مولوی فیض الحسن | اس زمانہ میں سہارن پور کے مشہور و معروف فاضل حضرت مولوی فیض الحسن بھی دہلی میں تشریف رکھتے اور درس دیا کرتے تھے۔ مولانا نے ان سے بھی پڑھا ہے حضرت مولوی صاحب۔ سرسیّد اور مولانا شبلی کے بھی اُستاد ہیں بعد میں اورنٹیل کالج لاہور میں تشریف لے گئے تھے۔ صاحبِ تصنیف بزرگ ہیں۔

۳۔ مولوی امیر احمد | مولانا نے ان سے دیوان متنبّی کے دو تین

قصیدے پڑھے تھے۔

۴۔ میاں نذیر حسین | شمس العلماء میاں سیّد نذیر حسین دہلی میں علم حدیث کے بہت بڑے مدرّس اور حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ مولانا نے ان سے بھی حدیث کا کچھ درس لیا ہے۔

۵۔ مرزا غالب | ان کا تعارف کرانا فضول ہے۔ آج کون ہے جو غالب کو نہیں جانتا۔ اور کون ہے جو اس بات سے ناواقف ہے کہ غالب کے شاگردوں میں سے شہرت اور کمال کے جس درجہ پر مولانا الطاف حسین پہنچے وہاں تک کوئی اور شاگرد نہ پہنچ سکا۔ بیشک غالب کے لئے یہ بہت بڑا فخر ہے کہ حالی جیسا یگانہ روزگار شخص اُس کا شاگرد ہے۔

شعر و سخن کا چسکا بچپن سے مولانا کو پڑا ہوا تھا۔ اُن کے اوّلین اُستاد سیّد جعفر علی اعلیٰ درجہ کے شاعر اور نہایت سخن سنج

واقع ہوئے تھے۔ اُس کا اثر لائق شاگرد پر بھی پڑا اور اُنہیں بچپن ہی سے شعر و سخن کا شوق ہو گیا۔ یہ شوق اتنا زبردست تھا کہ صرف و نحو کی خشک اور منطق و فلسفہ کی ادق اور دماغ کی لطافت کو چاٹ جانے والی کتابوں کی تحصیل میں دن رات مشغول رہنے کے باوجود بھی دب نہ سکا اور مولانا کو کشاں کشاں مرزا غالب کی خدمت میں لے گیا۔ اُن سے تلمذ کی داستان خود مولانا کی زبان سے سُنیئے:۔

"جس زمانہ میں میرا دلّی جانا ہُوا تھا تو مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور اکثر اُن کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے معنی اُن سے پُوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے اپنے دیوان میں سے اُنھوں نے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ اُن کی عادت تھی کہ وُہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر سے

منع کیا کرتے تھے۔ مگر مَیں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی میں لکھ کر اُن کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے"۔ مگر اُس زمانہ میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہُوا۔"

انگریزی نہ پڑھ سکنے کی وجوہات ۱۹۰۱ء میں لندن سے کسی انگریز مصنّف نے حیدر آباد نواب عماد الملک کو لکھا کہ مولانا حالی کے کچھ حالات لکھ کر بھیجدو۔ مولانا نہایت خاموش بزرگ تھے۔ نام و نمود اور عزّت و شہرت کی نہ کبھی خواہش کی۔ نہ کبھی اُس کا اظہار کیا۔ اس لیے عام طور پر مولانا کے حالات لوگوں کو معلوم نہ تھے۔ عماد الملک کہاں سے بھیج دیتے۔ آخر نواب صاحب نے خود مولانا کو لکھا۔ مولانا نے یہ ستم کیا کہ بجائے اس کے کہ اس

موقع سے فائدہ اٹھانے اور نہایت شرح و تفصیل سے اپنے سوانحی حالات لکھ کر بھیجتے۔ آپ نے صرف چند سطروں میں اپنے حالات جو بالکل ہی تشنہ اور قطعاً ناکافی تھے لکھ کر انہیں بھیجدیے۔ اس مختصر مضمون میں اپنی تصنیفات کا ذکر تو مولانا نے تھوڑا سا کیا ہے۔ مگر سوانحی اور ذاتی حالات کے بیان کرنے میں نہایت سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے۔ اس تحریر کی وہ سطور جن میں مولانا نے اپنے انگریزی نہ پڑھ سکنے کی وجوہات لکھی ہیں۔ مندرجۂ ذیل ہیں:-

"اگرچہ اُس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر جس سوسائٹی میں مَیں نے نشو و نما پائی تھی۔ وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اوّل تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا۔ اور اگر اُس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال

تھا تو صرف اِس قدر کہ وُہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہئے، نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء جَہَلے (جہالت کی جگہ) کہتے تھے۔ دِلّی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا۔ وہاں مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈھائی برس تک دلّی میں رہنا ہُوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں۔ اور نہ اُن لوگوں سے (اُس زمانہ میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہُوا جو اُس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ جیسے مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد۔ مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ"۔

دِلّی سے جبری واپسی اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ مولانا گھر والوں

سے روپوش ہو کر تحصیلِ علم کے لیے دلّی پہنچے تھے۔ چنانچہ گھر والے برابر تلاش اور جستجو میں تھے۔ دہلی کچھ دُور تو نہ تھی صرف چالیس کوس ہی تھی۔ شدہ شدہ پتہ لگ گیا کہ میاں الطاف حسین ایک مدرسہ میں مُلّا بنے بیٹھے ہیں۔ پتہ لگنے کی دیر تھی کہ بزرگ اور عزیز آن موجُود ہُوئے اور نہایت جبر اور مجبوری کے ساتھ بادلِ ناخواستہ اپنی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر مولانا کو اُن کے ساتھ وطن آنا پڑا۔ مولانا طبعًا نہایت خاموش طبع اور مؤدّب واقع ہُوئے تھے۔ اس لیے اس موقع پر بھی بھائی کے سامنے کچھ نہ بول سکے اور چُپ چاپ مگر بیحد رنجیدہ اور ملول پانی پت واپس آ گئے۔ یہ ۱۸۵۵ء کا واقعہ ہے۔

دہلی سے واپسی کے بعد مولانا اگرچہ چار و ناچار عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ گھر واپس آ گئے۔ مگر یہاں پہنچتے ہی بغیر اِدھر اُدھر نظر کیے پھر کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور مطالعہ میں ایسے

مصروف ہُوئے کہ سر پیر کی خبر نہ رہی۔ حالی کو اگر اُس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو یقین ہے کہ یہ انسان ساری عمر نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ کنجِ تنہائی میں بیٹھ کر تحصیلِ علم میں گزار دیتا۔ مگر قدرت کو اُس سے بڑے بڑے کام لینے تھے۔ اِس لیے مولانا اطمینان کے ساتھ تحصیل علم نہ کر سکے۔

ملازمت ابھی مولانا کو گھر آئے برس ڈیڑھ برس بھی مشکل سے گزرا تھا کہ لوگوں نے پھر مجبور کرنا شروع کیا کہ "میاں اس بیجد پڑھنے میں کیا رکھا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی نوکری ضرور تلاش کرنی چاہیے۔" اب کے یہ تقاضا اتنا شدید اور سخت ہوا کہ مجبوراً مولانا نے اپنی تعلیم کو بصد حسرت خیرباد کہا اور تلاشِ معاش میں گھر سے نکل کھڑے ہُوئے۔ پھرتے پھراتے حصار میں پہنچے اور وہاں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی لنکو مل گئی۔ مولانا نے کام شروع کیا۔ یہ سُن کر کہ الطاف حسین

نوکر ہوگئے۔ عزیز و اقارب تو خوش ہوگئے۔ مگر اپنی تعلیم کے مسدود ہونے کا جو صدمہ مولانا کے دل پر ہُوا۔ کچھ وہی اس کو اچھّی طرح محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ناچار اَور مجبور تھے۔ اگر نوکری نہ کرتے تو اَور کیا کرتے؟ یہ ۱۸۵۶ء کی بات ہے۔

۱۸۵۷ء کا غدر اور ملازمت کا چھوٹ جانا

ابھی مولانا کو ملازمت کرتے ایک ہی سال ہوا تھا کہ خدا کا غضب ہندوستان پر بالخصوص مسلمانوں پر غدر ۱۸۵۷ء کی شکل میں نمودار ہوا۔ اور ہزاروں خاندانوں کو تباہ اور لاکھوں آدمیوں کو برباد کر گیا۔ ہر طرف فتنہ و فساد اور قتل و غارت کے شعلے بلند ہونے لگے۔ اکثر جگہ سے سرکاری عملداری اُٹھ گئی اور تمام شمالی ہند میں وُہ لُوٹ مار مچی کہ خدا کی پناہ حصار بھلا اس بھڑکتی ہوئی آگ سے کس طرح محفوظ رہتا۔ وہاں بھی بعض سخت واقعات پیش آئے۔ نہ سرکار کا رعب قائم رہا نہ رعایا کا امن محفوظ رہا۔

اِس نازک صورتِ حالات میں مولانا نے عافیت اسی میں دیکھی کہ گھر واپس چلنا چاہیئے۔ اگرچہ ایسے سخت اور صعب وقت میں جبکہ تمام راستے باغیوں اور لٹیروں سے پٹے پڑے تھے۔ اتنا لمبا سفر طے کرنا آسان بات نہ تھی۔ لیکن جس طرح بھی بنا مصائب اور شدائد اٹھاتے ہوئے مولانا اُفتاں و خیزاں پانی پت پہنچ ہی گئے۔ عزیزوں نے دیکھا تو خوش ہو گئے۔ مگر اس وقت ہر ایک کو اپنی پڑی ہوئی تھی اور ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت انگریز یا باغی شہر پہ دھاوا بول دیں اور دم کے دم میں سارا پانی پت کھنڈر بن کر رہ جائے۔

خدا خدا کر کے یہ فتنۂ عظیمہ جو فتنۂ قیامت سے کسی طرح کم نہ تھا لاکھوں آدمیوں کی بھینٹ لینے کے بعد فرو ہوا۔ اور بقیۃ السیف لوگوں کو محسوس ہونے لگا کہ ابھی زندگی کے شاید کچھ سانس باقی ہیں۔ خدا کی پناہ! غدر۔ فساد اور بغاوت کس قدر ہلاکت خیز۔

تباہ کن اور نامراد بیماری ہے۔

ایامِ بیکاری میں تحصیلِ علم | غدر کا فتنہ اگرچہ ختم ہو گیا تھا۔ مگر ابھی حالت
ایسی نہ ہوئی تھی کہ بند شدہ کاروبار دوبارہ جاری ہو سکتے اور
امن و عافیت کا ہر طرف دور دورہ ہوتا۔ ایسے وقت میں تلاش
معاش کے لیے مولانا نے کہیں جانا مناسب نہ سمجھا۔ مگر بیکار
بیٹھنا بھی اُن کی فطرت کے خلاف تھا۔ اِس لئے ذرا اطمینان
ملتے ہی یہ پھر بدستور تحصیلِ علم میں مصروف ہو گئے۔ اُس وقت
پانی پت میں مولوی قاری عبدالرحمٰن محدّث۔ مولوی محب اللہ۔
اور مولوی قلندر علی عربی اور فارسی کے بڑے فاضل اور کامل
موجود تھے۔ مولانا نے ان تینوں سے بغیر کسی ترتیب اور نظام
کے کبھی حدیث و تفسیر اور کبھی منطق و فلسفہ پڑھنا شروع کیا۔
اور جب کوئی اُستاد ان میں سے پانی پت میں موجود نہ ہوتا تو
مولانا خود ہی بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ لٹریچر اور

ادب کی کتابیں شروح اور لغت کے وسیلے سے دیکھتے رہتے۔ ساتھ کے ساتھ عربی و فارسی شاعری کا سلسلہ بھی جاری تھا مگر مولانا اس زمانہ میں اصلاح اور مشورہ کسی سے نہیں لیا کرتے تھے۔ جتنا جی چاہتا خود ہی لکھتے اور خود ہی لطف اٹھاتے تھے۔ اگرچہ تعلیمی لحاظ سے مولانا کی عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا یہی تھا، جو اوپر بیان ہوا۔ مگر اس امر سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ مسلسل مشق و مزاولت اور فطری ذوق و ذہانت سے مولانا نے اپنی لیاقت کو بیحد بڑھا لیا تھا اور وہ عربی و فارسی کے ایک مسلم الثبوت عالم اور زبردست فاضل بن گئے تھے۔ اُن کی بہت سی نظم و نثر تصنیفات ہمارے اس دعویٰ کا بیّن ثبوت ہیں۔

ملازمتوں کا سلسلہ

تلاشِ معاش ۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے ملاقات اور اُن کی مصاحبت ۔ نواب صاحب کی وفات ۔ گورنمنٹ بکڈپو لاہور کی ملازمت ۔ اسسٹنٹ ایڈیٹری ۔ ایک جدید قسم کے مشاعرہ کا قیام ۔ لاہور سے واپسی ۔ اینگلو عربک سکول دہلی کی مدرسی ۔ بھائی کی وفات ۔ ایچیسن کالج لاہور میں تقرر ۔ دوبارہ دہلی کی واپسی ۔ سر آسمان جاہ سے ملاقات ۔ حیدر آباد سے وظیفہ کا تقرر ۔ ملازمت سے سبکدوشی ۔

تلاشِ معاش غدر کے بعد چار سال تک مولانا پانی پت میں تحصیلِ علم میں مشغول رہے ۔ لیکن آخر وقت آیا کہ تلاشِ معاش کی ضرورت نے آپ کو گھر سے نکلنے کے لیے مجبور کیا ۔ چنانچہ آپ بہت مایوسی

کے ساتھ اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر تلاشِ معاش کی فکر میں پانی پت سے نکلے اور دہلی پہنچے۔ اگرچہ دِلّی اُجڑ چکی تھی اور اہلِ کمال تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ مگر ہاتھی لٹے گا تب بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ اب بھی صاحبانِ ذوق کی علمی پیاس بجھانے کے لیے بہت سے شیریں چشمے اس میں بہ رہے تھے۔ مولانا دہلی پہنچے تو پھر اِن علمی مجلسوں اور شعر و سخن کی محفلوں کی رونق بن گئے۔ مدّت کے بعد اُجڑے دیس میں آئے تھے کچھ تو رہتے۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے ملاقات

مولانا کو دہلی آئے کچھ زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ آپ کی ملاقات اتفاقاً نواب شیفتہ سے ہوئی۔ نواب صاحب نے آپ کو نہایت جوہرِ قابل اور تمام اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ پاکیزہ سے متصف نوجوان دیکھا، تو اپنی مصاحبت اور اپنے بچّوں کی اتالیقی کے لیے آپ سے بہتر کسی کو نہ پایا۔ پس وُہ مولانا کو اپنے ساتھ جہانگیر آباد لے گئے

یہ ۱۸۶۳ء کا قصّہ ہے۔

نواب صاحب سے اس تعلق کا اظہار مولانا نے جن الفاظ میں کیا ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

"غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حُسنِ اتّفاق سے نواب مصطفٰے خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلّص کیا کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور سات آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے اُن کے ساتھ رہنے کا اتّفاق ہُوا۔

نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے اُس کی بہ نسبت اُن کا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہُوا تھا۔ اُنھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی کلام

مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر اُن کے مرنے کے بعد وُہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پُرانا شعر و سخن کا شوق جو مُدّت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا۔ اور اُن کی صحبت میں میرا میلانِ طبعی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اُسی زمانہ میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتّفاق ہُوا۔ اُنہی کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہُوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہُوا وُہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہُوا۔ وُہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی باتوں کو محض حُسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال

شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔

نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اِس ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ اُنہوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ پہلا مصرع پڑھا۔ ع

آج شبیّر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا۔ یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔

اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔"

نواب صاحب کی وفات مولانا کا تعلق نواب صاحب سے اُن کی وفات تک رہا۔ جب ۱۸۶۹ء میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تو پھر مولانا کو کسی دوسرے ذریعہ معاش کی فکر ہوئی۔

گورنمنٹ بکڈپو لاہور کی ملازمت

اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔ جہانگیر آباد کا تعلق قطع ہوتے ہی اُس نے ایک دُوسرا ذریعہ مولانا کے لیے حصولِ معاش کا نکال دیا۔ چنانچہ اُن کو فوراً گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ایک جگہ مل گئی۔ گورنمنٹ بکڈپو کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی کتابوں سے طلبائے مدارس کے لئے ترجمے کر کے اُنہیں شائع کیا جائے۔ یہی بکڈپو ہے جو ۱۸۷۷ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے نام سے موسوم کر دی گئی اور اس وقت تک کام کر رہی ہے۔ مولانا کے سپرد اس بکڈپو میں یہ خدمت تھی کہ جو کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہوں اُن کی عبارت الفاظ اور محاورات کے لحاظ سے درست کیا کریں۔

مولانا فرماتے ہیں "تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور

خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی"۔
اس اثر کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور اثر بھی انگریزی لٹریچر کے ترجمے کے مطالعہ سے مولانا نے قبول کیا اور وُہ اپنی تحریر میں بکثرت انگریزی الفاظ کا استعمال ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انگریزی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود اس کثرت کے ساتھ مولانا نے حیاتِ جاوید میں انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ناواقف آدمی کو یقین ہی نہیں آسکتا کہ مصنف کتاب قطعاً انگریزی سے نابلد ہے۔

اسسٹنٹ ایڈیٹری اخبار انجمن پنجاب

۱۸۶۹ء کے اوائل میں "اخبار انجمن پنجاب" کے نام سے سررشتۂ تعلیمات پنجاب کی طرف سے ایک اخبار جاری ہُوا، جو عرصہ تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ لیکن بعد میں سرکار نے اُسے ماہوار کر کے اُس کا نام "اتالیق پنجاب" رکھ دیا۔ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال اس کے

ایڈیٹر تھے۔ مولانا بھی کچھ عرصے تک اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے ہیں۔

ایک جدید قسم کے مشاعرے کا قیام

مولانا کے قیام لاہور کے زمانہ میں مولوی محمد حسین آزاد دہلوی نے کرنیل ہالرائڈ صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات پنجاب کے ایماسے ۱۸۷۴ء میں ایک جدید مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان تمام شعراء کو دے دیا جاتا تھا اور مشاعرے میں شعراء اپنے اپنے ذوق کے مطابق اُس مضمون پر طبع آزمائیاں کیا کرتے تھے۔ یہ مشاعرے انجمن پنجاب کے دفتر میں بڑی شان و شوکت سے ہوا کرتے تھے اور چونکہ نئی چیز تھے۔ لہٰذا لوگ بڑے شوق اور نہایت دلچسپی سے اُن میں شریک ہو کر لطف اُٹھایا کرتے تھے۔ مولانا بھی ان مشاعروں میں شامل ہوئے ہیں۔ اور آپ کی سب سے پہلی چار دلچسپ مثنویاں

یعنی برکھا رُت[1] - نشاطِ اُمید[2] - تعصب[3] و انصاف اور حُبِ وطن[4]
انہی مشاعروں کی یادگار ہیں -

لاہور سے واپسی | بھلا جس شخص نے دہلی کی پُر لطف علمی صحبتوں
کے مزے لُوٹے ہوں - اُس شخص کا دل لاہور جیسے شہر میں
کیا لگ سکتا تھا - جہاں اُس وقت علمی تذکرے تقریباً مفقود
تھے - اُس زمانہ کا لاہور آجکل جیسا لاہور نہیں تھا - جہاں علم
کے دریا بہہ رہے ہیں اور زمانہ بھر کے اہلِ کمال اور ادیب
سمٹ کر اس میں جمع ہو گئے ہیں - بلکہ وُہ لاہور ایسا لاہور
تھا کہ حالی جیسے سنجیدہ - خاموش اور بے نفس انسان کو
بھی اس کی ہجو لکھنی پڑی - چنانچہ فرماتے ہیں ؎

رہے لاہور میں آکر سو جانے - یہی دُنیا ہے جو دار المحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

اس صورتِ حالات میں لاہور کا قیام مولانا کے لیے

ایک جنجال ہوگیا۔ علاوہ ازیں یہاں کی آب و ہوا بھی مولانا
کو موافق نہیں آئی اور مولانا آئے دن بیمار رہنے لگے۔ آخر
سخت مجبور ہوکر آپ نے اپنا تبادلہ اینگلو عربک سکول دہلی
کا کرالیا۔

اینگلو عربک سکول دہلی کی مدرسی | اینگلو عربک سکول دہلی میں
آپ ۱۸۷۴ء کے آخر یا ۱۸۷۵ء کی ابتدا میں آئے ہیں۔
یہاں آپ عربی کے مدرّس اوّل تھے۔ جس خوبی جس عمدگی
اور جس لیاقت کے ساتھ آپ یہاں طلباء کو تعلیم دیا کرتے
تھے۔ اُس کی حلاوت کوئی اُن لوگوں سے پُوچھے جنہوں نے
یہاں آپ سے پڑھا ہے اور بعض آدمی اُن میں سے اس
وقت بھی زندہ موجود ہیں۔

یہ ملازمت مولانا کی طبیعت کے موافق ثابت ہوئی اور
مولانا یہاں نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ درس و

تدریس میں مشغول ہو گئے۔

یہاں مولانا کا دل لگ جانے کی تین وجوہات تھیں۔ اوّل[۱] تو دلّی کی پُرلطف صحبتیں تھیں جن کو یاد کر کے مولانا ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ دُوسرے[۲] یہاں کی آب و ہوا مولانا کے موافق تھی۔ تیسرے[۳] وطن کا قرب تھا۔ یہی اسباب تھے جن کے یکجا جمع ہو جانے کی وجہ سے مولانا یہاں خوش اور مطمئن تھے اور آپ نے اسی اطمینان کو پاکر اُس وقت متعدد علمی کام کیے۔ جن میں سے سب سے زیادہ مہتم بالشان "مسدس" کی تصنیف ہے۔ جو سر سید کی فرمائش پر آپ نے لکھی۔

بھائی کی وفات | ۱۸۸۶ء میں مولانا کے برادرِ بزرگ خواجہ امداد حسین بیمار ہو کر بغرضِ علاج دہلی گئے اور مولانا کے پاس ٹھیرے۔ پانچ چھ ماہ ہر قسم کا علاج معالجہ ہوتا رہا۔ مگر کچھ فائدہ

نہ ہوا اور بالآخر اُن کا انتقال ہوگیا۔ مولانا کو بھائی کی وفات کا بیحد صدمہ ہوا۔ کیونکہ یہ وُہی بھائی تھا۔ جس نے مولانا کو نہایت شفقت و محبّت کے ساتھ پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔ مولانا نے اپنے دیوان میں ان کا جو دردناک مرثیہ لکھا ہے پڑھنے کی چیز ہے۔ ایک ایک مصرع سے درد اور اثر ٹپکا پڑتا ہے۔ خواجہ امداد حسین دہلی میں خواجہ باقی باللہؒ کے قبرستان میں دفن کیے گئے تھے۔ ممکن ہے آج بھی اُن کی قبر کا نشان باقی ہو۔ اگرچہ مجھے بہت تلاش کے بعد بھی نہیں ملی

ایچیسن کالج لاہور میں تقرر اینگلو عربک سکول دہلی کی مدرّسی کے دَوران ہی میں آپ کا تقرر ایچیسن کالج لاہور کے بورڈنگ ہوس میں ہوگیا تھا۔ جہاں آپ طلباء کے اتالیق کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے۔

دوبارہ دہلی کی واپسی بہت ہی جلد مولانا کی طبیعت امراء و شرفاء

کے سپوتوں سے اُکتا گئی، جو اُس وقت وہاں تعلیم پاتے تھے اور ابھی اس جدید عہدے کو آٹھ مہینے بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ آپ جون ۱۸۸۷ء میں پھر واپس اپنی جگہ پر دہلی آگئے۔

سر آسمان جاہ سے ملاقات

اِسی زمانہ میں جبکہ مولانا دہلی میں مدرس تھے۔ ۱۸۸۷ء مطابق ۱۳۰۵ھ کا واقعہ ہے کہ نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام حضور نظام شملہ تشریف لائے، تو سر سید نے اُن سے علیگڈھ چلنے اور کالج کا ملاحظہ کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ جس وقت سر آسمان جاہ علیگڈھ پہنچ کر سر سید کی کوٹھی میں فروکش ہوئے، تو سر سیّد نے دہلی سے مولانا کو بھی بلا بھیجا۔ اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ اُن کا تعارف سر آسمان جاہ سے کرایا اور اُن کے علم و فضل اور شاعری کی بے حد تعریف کی۔ سر آسمان جاہ مولانا سے مل کر نہایت محظوظ اور مسرور ہوئے۔

حیدر آباد سے وظیفہ کا تقرر | اِس ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ سر سید کی سفارش پر سر آسمان جاہ نے بصیغۂ امداد مصنّفین ۷۵ روپے ماہوار کا وظیفہ ریاست سے مولانا کے نام مقرر فرما دیا اور اس طرح مولانا فکرِ معاش سے ہمیشہ کے لیے مستغنی ہو گئے۔

ملازمت سے سبکدوشی | مولانا کے مزاج میں لالچ اور طمع کا کوئی ذرّہ بھی نہیں تھا۔ جب وظیفہ جاری ہو گیا اور فکرِ معاش سے بیفکری ہو گئی، تو آپ چونکہ نوکری کی چنداں ضرورت نہ رہی تھی۔ اس لیے آپ نے اگست ۱۸۸۹ء میں عربک سکول کی ملازمت چھوڑ دی۔ اور جو وظیفہ ملتا تھا۔ اُسی پر قانع رہے۔

دہلی چھوڑنے کی وجہ۔ ایک عظیم الشان مطبع جاری کرنے کا خیال۔
حیدر آباد کا سفر اور وظیفہ میں بیشی۔ علمی مشاغل میں مصروفیت۔
اہلیہ کا انتقال۔ خطاب شمس العلماء کا ملنا۔ ایک پبلک
لائبریری کا قیام۔ حیدر آباد کا دوسرا سفر۔ آنکھ میں پانی اُترنا۔
آپریشن۔ صدارت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔

دہلی چھوڑنے کی وجہ یہ زمانہ جبکہ آپ نے اینگلو عربک سکول کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کی۔ ایسا تھا کہ دہلی کی قدیم صحبتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ مولانا کے بڑے بڑے دوست اور سخن فہم حضرات مولانا کو داغِ مفارقت دے چکے تھے اور اب

اُن کے بغیر محفل سُونی تھی۔ ظاہر ہے کہ مولانا کا دل ایسی نگری میں اب کیا لگ سکتا تھا۔ جب اُنھیں مرحوم دوستوں اور یارانِ محفل کی یاد نے تڑپایا تو کس درد سے کہتے ہیں ؎

غالبؔ ہے۔ نہ شیفتہؔ۔ نہ نیرؔ باقی

وحشتؔ ہے نہ سالکؔ ہے نہ انورؔ باقی

حالیؔ اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو

یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

دُوسری جگہ اس سے بھی زیادہ مؤثر الفاظ میں دہلی کی اُجڑی محفل پر ماتم کرتے ہیں ؎

شاعری مر چکی، اب زندہ نہ ہو گی یارو

یاد کر کے اُسے جی نہ کُڑھانا ہرگز

غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ

اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنوں کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانا ہرگز

آخر نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ مولانا زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتے ہوئے پانی پت کو روانہ ہو گئے۔ جو بالکل اُن کے حسبِ حال تھا۔ یعنی ؎

کُوچ سب کر گئے دلّی سے تیرے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

ایک عظیم الشان مطبع جاری کرنے کا خیال

اینگلو عربک سکول کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد مولانا کا خیال تھا کہ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ایک عظیم الشان مطبع اور اُس کے ساتھ ہی ایک بکڈپو قائم کی جائے۔ مطبع میں قدما کی وہ عربی و فارسی کتب جو اب

نایاب اور مفقود ہیں نہایت تلاش سے فراہم کر کے شائع کی جائیں اور بکڈپو کے ذریعہ اُن کو ملک میں فروخت کیا جائے نیز جو اعلیٰ کتابیں ردّی اور بُرے کاغذ پر غلط سلط چھپی ہوئی ہیں۔ اُن کے نہایت صحیح اور اعلیٰ ایڈیشن ملک کے سامنے پیش کئے جائیں۔

خیال اور ارادہ نہایت معقول اور عمدہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کیا وجوہات ہوئیں کہ عمل کی صورت اختیار نہ کر سکا۔

حیدر آباد کا سفر اور وظیفہ میں بیشی

سنہ ۱۸۹۱ء میں کالج کی امداد کی درخواست لیکر ٹرسٹیانِ کالج کا ایک ڈیپوٹیشن زیر سرکردگی سرسید حیدر آباد گیا تھا۔ اس ڈیپوٹیشن میں مولانا بھی شامل تھے۔ اُس موقع پر جو وظیفہ ۷۵ مبلغ ماہوار آپ کو ملتا تھا۔ اس میں ۲۵ مبلغ کا اضافہ ہو کر پُورے سو روپے سکّہ حالی آپ کو ملنے لگے۔ اور وفات تک یہ وظیفہ برابر جاری رہا۔

علمی مشاغل میں مصروفیت حیدرآباد سے واپس آکر نہایت خاموشی مگر پورے انہماک کے ساتھ آپ خدمتِ علم اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ معاش کی طرف سے چونکہ بےفکری تھی۔ لہٰذا آپ اپنا سارا وقت اسی محبوب مشغلے میں بسر کرتے اور کسی اور طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے۔ چنانچہ شعر و شاعری پر لاجواب مقدمہ۔ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید جیسی پُردو زیست اور زندہ جاوید تصانیف اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

اہلیہ کا انتقال اسی دوران میں ۲۲ اگست ۱۹۰۰ء کو آپ کی اہلیہ اسلام النسا کا ہیضہ سے انتقال ہو گیا۔ یہ نہایت منتظم۔ باسلیقہ اور خوش اخلاق خاتون تھیں اور اُن کے انتقال سے مولانا کو قدرتاً نہایت درجہ رنج اور صدمہ ہوا۔ مگر مشکلات و مصائب کا یہ پہاڑ بھی مولانا کے تصنیفی انہماک کی راہ میں حائل نہ ہو سکا۔ اُس وقت آپ نہایت تندہی سے سرسید کی

لائف "حیاتِ جاوید" طبع کر وا رہے تھے۔ مگر باوجود اس المناک صدمہ کے آپ نے کام روکا نہیں اور شب و روز کی محنت کے بعد اُسے اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع کر دیا۔

خطاب شمس العلماء کا ملنا | جون ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ اس خطاب سے ملک کے علمی حلقے میں نہایت خوشیاں منائی گئیں۔ بعض لوگوں نے بذریعہ تار مبارکباد بھیجی۔ بہت سے بڑے بڑے لوگوں نے خطوط سے اپنی مسرّت کا اظہار کیا۔ ان تمام دلچسپ خطوط میں سے ہم یہاں صرف ایک خط مولانا شبلی کا نقل کرتے ہیں، جو سارے خطوط میں سب سے زیادہ مختصر مگر سب سے زیادہ جامع ہے اور مولانا شبلی نے بخار میں لیٹے لیٹے لکھا ہے۔ سُنیے

مولانا!

آپ کو تو نہیں۔ لیکن خطاب شمس العلمائی کو مبارکباد

دیتا ہوں اب جاکر اس خطاب کو عزّت حاصل ہوئی۔

بخار کی حالت میں اسی قدر لکھ سکتا تھا۔

شبلی

۳۰ رجون ۱۹۰۴ء

اس خطاب کے متعلق جو کچھ مولانا حالی کا اپنا خیال تھا۔ ذرا وہ بھی سن لیجیے۔ تاکہ اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکے کہ کہ آپ شہرت۔ عزّت اور نام و نمود سے کتنی دُور بھاگتے تھے چنانچہ خطاب ملنے کے بعد ۲۲ رجولائی ۱۹۰۴ء کو اپنے لڑکے خواجہ سجّاد حسین صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے۔ جس کی ہمارے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لیے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی

حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا تھا اور ایسے مواقع سے
ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم
ضلع پانی پت میں آویگا۔ یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر
کرنال میں بدل کر آویگا لامحالہ وہاں جانا پڑیگا.....
بھلا میں کہاں اور یہ دردسر کہاں"۔

ایک پبلک لائبریری کا قیام ۱۹۰۵ء میں مولانا نے پانی پت
کے علمی ذوق رکھنے والے اشخاص کے لیے ایک نہایت
مفید کام کیا۔ اور وہ "وکٹوریہ میموریل پبلک لائبریری پانی پت"
کا قیام ہے۔ اس کی بنا اس طرح پڑی کہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے
انتقال پر دو ہزار روپے کے قریب چندہ اُن کی یادگار قائم
کرنے کی غرض سے مولانا نے خود پھر کر شہر کے مختلف لوگوں
سے جمع کیا تھا۔ اس روپیہ کا مصرف یہ سوچا گیا تھا کہ ملکہ کی
یادگار میں اس روپیہ سے قصبہ میں ایک ہائی سکول بنا دیا

جائے۔ جس کی اشد ضرورت تھی۔ مگر دو ہزار کی قلیل رقم
اس ہائی سکول کے اجرا کے لیے قطعًا ناکافی تھی۔ کوشش
کی گئی کہ اور چندہ ہو جائے تاکہ ہائی سکول کا خیال عملی جامہ
پہن سکے۔ مگر مزید چندہ کا انتظام نہ ہو سکا۔ مولانا اس کمیٹی
کے سکرٹری تھے۔ جب اور روپیہ جمع ہوتا نظر نہ آیا تو مولانا
نے بہت کچھ سوچنے کے بعد بجائے ہائی سکول کے ملکہ وکٹوریا
کی یادگار میں ایک پبلک لائبریری شہر کے وسط میں قلعہ پر
قائم کرنے کی تحریک پیش کی۔ یہ تحریک منظور ہو گئی اور مولانا
نے اس روپیہ سے عربی۔ فارسی۔ ہندی۔ انگریزی کی چیدہ
اور مفید کتابیں منگا کر ایک پبلک لائبریری کی بنیاد ڈالدی۔
یہ پبلک لائبریری شہر میں اب تک قائم ہے۔ اور اس کی
کتابوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ شروع سے
شہر کی میونسپل کمیٹی لائبریری مذکور کو کچھ رقم ماہوار دیا کرتی

تھی جس سے اُس کے اخراجات چلا کرتے تھے۔ مگر اب کچھ عرصہ سے بلدیہ نے کلیتہً اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور ایک شاندار عمارت اُس کے لیے بنائی ہے۔

حیدر آباد کا دوسرا سفر ۱۹۰۵ء ہی میں مولانا کو اعلیٰحضرت حضور نظام میر محبوب علی خاں کے جشن چہل سالہ سالگرہ کی روئیداد مرتب کرنے کے لیے سرکاری طور پر حیدر آباد بلایا گیا۔ اس پر آپ اخیر دسمبر ۱۹۰۵ء میں دوبارہ حیدر آباد تشریف لے گئے۔

ایک آنکھ میں پانی اُتر آیا چھ سات مہینے کے بعد جب شروع جون ۱۹۰۶ء میں آپ حیدر آباد سے واپس تشریف لائے، تو اس وقت آپ کی داہنی آنکھ میں پانی اُتر آیا جس کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا کام اور لکھنا پڑھنا بالکل ترک ہو گیا۔

آپریشن ۱۹۰۷ء میں آپ نے راجندر ہاسپٹل پٹیالہ میں

آنکھ کا اپریشن کرایا تاکہ بینائی میں کچھ ترقی ہو۔ لیکن یہ اپریشن کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہُوا۔ صرف اتنا البتّہ ہُوا کہ لکھنے پڑھنے کا تھوڑا بہت معمولی کام بہت تکلّف سے آپ کر لیتے تھے۔

صدارت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

اسی سال کے دسمبر میں آپ کو کراچی کا طویل سفر اختیار کرنا پڑا۔ جہاں اُس سال آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہونا قرار پایا تھا اور مولانا اُس کے صدر منتخب ہُوئے تھے۔ جو خطبۂ صدارت آپ نے وہاں پڑھا۔ وُہ کانفرنس کی رپورٹ میں چھپا ہُوا مَوجُود ہے اَور علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں بھی اُسی وقت شائع ہُوگیا تھا۔

باب ششم

عمر کے آخری ایّام

آخری عمر میں سکون کی تلاش مگر مکروہات و مصائب کا زور۔ دُوسری آنکھ کا آپریشن۔ باوجود ضعیفی و مصائب کے تصنیف و تالیف میں انہماک۔ وفات

آخری عمر میں سکون کی تلاش مگر مکروہات و مصائب کا زور

آخر عمر میں ہر شخص آرام و سکون کا خواہشمند ہوتا ہے۔ مولانا بھی طبعًا یہ بات چاہتے تھے کہ اس بڑھاپے میں کچھ سکون ملے اور دماغ کو کچھ آرام نصیب ہو، تو کوئی علمی کام انجام پائے۔ مگر افسوس اس آخری عمر میں بعض خانگی پریشانیوں سے آپ کو ایسا سابقہ پڑا کہ آپ کا آرام و سکون بالکل رخصت ہوگیا۔ کوئی دم بھی

آپ کو اطمینان کا نہ ملتا تھا۔

اِن خانگی جھگڑوں بکھیڑوں سے دل برداشتہ ہو کر مولانا نے کہیں باہر چلا جانا چاہا، تاکہ کسی خاموش اور تنہا مقام پر بیٹھ کر کچھ علمی خدمت کریں۔ مگر اپنے ایک نواسے عبدالولی کی مسلسل اور دائمی بیماری کے باعث جس کو بچپن سے اِس وقت تک مرگی کے نہایت سخت دورے اُٹھتے ہیں، مولانا بہت ناچار اور پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ نہ وُہ اُس کو چھوڑ کر کہیں باہر جا سکتے تھے اور نہ اُس کی وجہ سے وطن میں آرام و سکون سے رہ سکتے تھے۔ عبدالولی کے والد فوت ہو چکے تھے اور مولانا کے سوا اُس وقت اور کوئی اُس کا نگران اور ہمدرد نہ تھا۔ ایسی حالت میں بھلا کس طرح ممکن تھا کہ مولانا جن کا دل دوسروں کی مصیبت اور تکلیف دیکھ کر بےچین اور مضطرب ہو جاتا تھا، اپنی بیٹی اور نواسے کو ایسی پریشانی

اور بیماری کی حالت میں چھوڑ کر لمبے عرصہ کے لئے کہیں
چلے جانے۔ پس جس طرح بھی ممکن ہوا مشکلات و مصائب
کے آخری ایام مولانا نے وطن ہی میں بسر کیے۔

دوسری آنکھ کا آپریشن ۱۹۰۷ء میں آپ نے داہنی آنکھ
کا آپریشن کرایا تھا۔ اور بائیں آنکھ تھوڑا بہت کام کرتی تھی
مگر ۱۹۱۱ء میں اس میں بھی پانی اتر آیا۔ اس پر آپ نے
لکھنؤ میں اس کا آپریشن کرایا۔ مگر اس سے بھی بینائی میں
کچھ ترقی نہیں ہوئی اور آپ واپس پانی پت آگئے۔

باوجود ضعیفی و مصائب کے تصنیف و تالیف میں انہماک آخری عمر میں مولانا کی خواہش تھی
کہ اپنا سارا منظوم کلام ایک جگہ
جمع کر کے نہایت عمدہ اور خوشخط چھپوا دیں کیونکہ آپ کی
بہت سی متفرق نظمیں لوگ نہایت ردّی کاغذ پر بدترین
لکھائی چھپائی کے ساتھ نہایت غلط سلط چھاپ کر دھڑا دھڑ

فروخت کر رہے تھے۔ اور انہیں دیکھ دیکھ کر آپ کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ مگر اپنے اعلیٰ اخلاق کے باعث کسی کو چھاپنے سے منع نہ کرتے تھے۔ اس وجہ سے آپ نے ضرورت محسوس کی کہ ایک مرتبہ نہایت صحت اور اہتمام کے ساتھ اپنا سارا کلام خود شائع کر دیں۔ اس خیال سے باوجود پیرانہ سالی۔ ضعفِ بصارت۔ عوارضات اور مختلف پریشانیوں کے آپ نے اس اہم کام کو سرانجام دینے کا پورا تہیّہ کر لیا۔ اس کے لیے پہلے تو اپنی ساری پراگندہ اور متفرق نظموں کو ایک جگہ جمع کیا۔ کہ یہ بھی ایک بہت بڑا کام تھا۔ اس کے بعد بہت دنوں تک انھیں ترمیم و تنسیخ کرتے رہے۔ پھر خیال آیا کہ اردو کلیاتِ نظم سے پہلے جتنا فارسی اور عربی کلام ہے۔ وہ سب مرتب اور جمع ہو کر شائع ہو جانا چاہیئے۔ اس پر آپ نے اردو کلام کی تدوین ملتوی کر کے فارسی اور عربی کلیات کی طرف

توجہ فرمائی۔ مگر اس کے لیے کامل طور سے نہایت خاموشی اور
تنہائی کی ضرورت تھی اور وہ پانی پت میں ملنی محال تھی اس
لیے آپ ۱۹۱۲ء میں اپنے عزیز اور ہموطن ڈاکٹر لیاقت حسین صاحب
کے پاس فرید آباد (ضلع دہلی) بھی چار پانچ ماہ تک جاکر
رہے۔ تاکہ وہاں شاید کچھ سکون ملے اور کچھ کام ہو سکے۔
مگر ملنے والوں اور عقیدت مندوں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔
اور رات کے بارہ بجے تک لوگ بےفکری اور اطمینان
کے ساتھ مولانا کو گھیرے بیٹھے رہتے تھے۔ نہایت مجبور
ہو کر مولانا پھر پانی پت چلے آئے۔ لیکن جس طرح بن سکا
کام جاری رکھا اور سخت محنت اٹھانے کے بعد خدا خدا
کر کے مسودہ پریس میں بھیج دیا۔ مولانا کے عربی و فارسی
کلام کا یہ مجموعہ مولانا کے انتقال سے چند ماہ پیشتر اگست ۱۹۱۴ء
میں چھپ کر شائع ہو گیا تھا۔

وفات | اس کے بعد اُردو کلیاتِ نظم کی ترتیب اور طباعت کا مرحلہ تھا۔ مگر افسوس موت نے زیادہ مہلت نہ دی۔ اور مختصر علالت کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو آہستہ آہستہ اللہ اللہ کہتے ہوئے مولانا ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

توجہ فرمائی۔ مگر اس کے لیے کامل طور سے نہایت خاموشی اور تنہائی کی ضرورت تھی اور وہ پانی پت میں ملنی محال تھی اس لیے آپ ۱۹۱۲ء میں اپنے عزیز اور ہموطن ڈاکٹر لیاقت حسین صاحب کے پاس فرید آباد (ضلع دہلی) بھی چار پانچ ماہ تک جاکر رہے۔ تاکہ وہاں شاید کچھ سکون ملے اور کچھ کام ہو سکے۔ مگر ملنے والوں اور عقیدت مندوں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور رات کے بارہ بجے تک لوگ بےفکری اور اطمینان کے ساتھ مولانا کو گھیرے بیٹھے رہتے تھے۔ نہایت مجبور ہو کر مولانا پھر پانی پت چلے آئے۔ لیکن جس طرح بن سکا کام جاری رکھا اور سخت محنت اٹھانے کے بعد خدا خدا کر کے مسودہ پریس میں بھیج دیا۔ مولانا کے عربی و فارسی کلام کا یہ مجموعہ مولانا کے انتقال سے چند ماہ پیشتر اگست ۱۹۱۴ء میں چھپ کر شائع ہو گیا تھا۔

وفات | اس کے بعد اُردو کلیاتِ نظم کی ترتیب اور طباعت کا مرحلہ تھا۔ مگر افسوس موت نے زیادہ مہلت نہ دی۔ اور مختصر علالت کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو آہستہ آہستہ اللہ اللہ کہتے ہوئے مولانا ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اولاد

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ مولانا کی شادی ۱۷ برس کی عمر میں سید باقر علی کی لڑکی اسلام النساء سے ۱۸۵۲ء میں ہوئی تھی۔ ان سے جو کچھ اولاد ہوئی۔ اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ اخلاق حسینؒ

مولوی خواجہ حافظ اخلاق حسین ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مولانا کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین مظہر کے چونکہ کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے اُنھوں نے خواجہ اخلاق حسینؒ کو اپنا متبنّیٰ بنا لیا تھا۔ چنانچہ خواجہ امداد حسینؒ کی تمام جائداد انھی کو

ملی - نہایت خاموش - نیک طبیعت - منکسر المزاج - خوش خلق اور عابد و زاہد بزرگ تھے - جب آپ بسلسلۂ ملازمت پھپوند میں مقیم تھے تو وہاں حضرت شاہ عبد الصمد سہسوانی کے ہاتھ پر سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں بیعت ہو گئے تھے - جناب شاہ صاحب سہسوان سے پھپوند میں تشریف لے آئے تھے - مولوی اخلاق حسینؒ صاحب کی وفات دہلی میں ۲۰ فروری ۱۹۲۴ء کو ہوئی - آپ کی اولاد مندرجہ ذیل ہوئی :-

۱ - مشتاق فاطمہ - یہ آنریبل خواجہ غلام الثقلین کی بیوی تھیں - جن کے لڑکے خواجہ غلام السیدین بی - اے ایم - ای - ڈی آجکل مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہیں -

۲ - احتفاق حسینؒ - یہ صاحب آج کل صاحب ڈپٹی کمشنر

رہتک کے سٹینوگرافر ہیں۔

۳۔ اکرام حسین ؒ۔ نہایت ہی نیک اور صالح نوجوان تھے۔ افسوس کہ عین جوانی میں بعارضہ سرسام ۱۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کو انتقال کیا۔ ان کے دو بچے ہیں۔ انعام حسین اور افضال حسین اوّل الذکر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں اور ثانی الذکر حالی مسلم ہائی سکول میں تعلیم پا رہا ہے۔

۴۔ صدیقۃ النساء۔ یہ خان بہادر خواجہ تصدق حسین ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج کے لڑکے خواجہ احمد حسین ؒ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ افسوس ہے کہ ۹ فروری ۱۹۳۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ تین لڑکیاں چھوڑیں جن کے نام عباس فاطمہ مجتبائی اور ارشاد فاطمہ ہیں۔

۲۔ عنایت فاطمہ

عنایت فاطمہ کی ولادت ۱۸۵۹ء میں ہوئی تھی۔ ان کے

شوہر کا نام خواجہ عبدالعلی تھا، جو خان بہادر خواجہ تصدق حسین ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج کے بھائی تھے۔ عنایت فاطمہ نے ۱۹۱۵ء میں وفات پائی اور تین اولادیں چھوڑیں۔ دو لڑکے جن کے نام خواجہ فرزند علی اور خواجہ عبدالولی ہیں۔ ایک لڑکی جس کا نام سعیدہ بیگم ہے اور جو منشی حامد علی صاحب تحصیلدار کی بیوہ ہیں۔ منشی صاحب کا تھوڑا عرصہ ہوا۔ انتقال ہو گیا۔ سعیدہ بیگم کے دو لڑکے ہیں محمود علی اور حامد علی۔

۳۔ سجّاد حسینؒ

خواجہ صاحب محترم ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ قرآنِ مجید حفظ کرانے کے بعد مولانا نے اُن کو انگریزی تعلیم دلائی۔ اور انٹرنس پاس کرنے کے بعد فروری ۱۸۸۰ء میں مدرستہ العلوم علیگڈھ کی ایف۔ اے کلاس میں داخل کرا دیا۔ جہاں سے ۱۸۸۴ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ علیگڈھ کالج کے

اوّلین طلبہ میں سے ہیں۔ ڈگری ملنے کے بعد آپ وہیں سکول میں مدرس مقرر ہو گئے اور پھر کالج میں اسسٹنٹ پروفیسری آپ کو مل گئی۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۸۷ء میں آپ کا تقرر بعہدۂ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز عمل میں آیا اور سب سے پہلے ضلع فیروزپور میں آپ کو تعینات کیا گیا۔ جس کے بعد پنجاب کے مختلف اضلاع میں آپ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ۲۱ فروری ۱۹۱۵ء کو جب مشاہیر اور رہنمایانِ ملک کا ایک عظیم الشان اجتماع مولانا مرحوم کی فاتحہ خوانی کے لیے پانی پت میں ہُوا، تو وہاں قرار پایا کہ مولانا کی یادگار کے طور پر مسلم سکول کو جس کی بنیاد مولانا کی زیرسرپرستی اُن کی زندگی ہی میں رکھی جا چکی تھی ہائی سکول تک ترقّی دی جائے اور اُس کا نام "حالی مسلم ہائی سکول" رکھا جائے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۱۵ء میں ہائی سکول قائم کر دیا گیا اور مخدومی خواجہ سجاد حسین

صاحب اُس کے آنریری سکرٹری مقرر کیے گئے۔ اس
ہائی سکول کی خدمت کے پیچھے سب سے اوّل تو خواجہ صاحب
محترم نے اپنی ملازمت قربان کی۔ یعنی قبل از وقت پنشن
لے لی اور پھر یکے بعد دیگرے اپنا مال۔ جائیداد۔ صحت۔
عافیت۔ اطمینان اور سکون غرض سب کچھ تباہ کر دیا اور آخر
میں آکر آنکھیں بھی اسی کی نذر ہوئیں۔ اس بیس برس کے
طول طویل زمانہ میں ہائی سکول کے لیے جس قدر تکلیفیں۔
جس قدر مصیبتیں اور جس قدر پریشانیاں آپ نے اٹھائی
ہیں اور اٹھا رہے ہیں۔ اُس کے بیان کے لیے ایک طویل
دفتر درکار ہے۔ مگر ناقدر دان اور ناشکر گذار اہل وطن کی طرف
سے ان تمام تکالیف کا معاوضہ سوائے فضول اور لا یعنی
اعتراضوں کے کبھی کچھ نہ ملا۔ اور قوم کے پُرخلوص اور سچّے
خادموں کو ہمیشہ قوم کی طرف سے اُن کی اَن تھک کوششوں

اور خدمتوں کا یہی صلہ ملا بھی کرتا ہے۔ خود خواجہ صاحب کے والد کہہ گئے ہیں ؎

کہدو اجنھیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ
طعنے جھیلو۔ بُرا سُنو۔ گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سردست
گر اِس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ

دیگر اولاد

مولوی[۱] اخلاق حسین، عنایت[۲] فاطمہ۔ خواجہ[۳] سجاد حسین کے علاوہ مولانا کے تین بچّے اور بھی ہوئے۔ ایک کا نام اعتقاد[۴] حسین تھا۔ یہ سات آٹھ برس کا ہو کر انتقال کر گیا۔ ایک لڑکی رقیہ[۵] خاتون دس گیارہ برس کی ہو کر مر گئی۔ اس کے بعد ایک لڑکا اور ہوا تھا۔ جو صرف چند مہینے جیا۔ خاکسار راقم نے مخدومی خواجہ سجاد حسین صاحب سے اس بچے کا نام پوچھا تھا مگر اُنھوں نے فرمایا کہ میرے یاد نہیں رہا۔

باب ہشتم

منظوم تصانیف

مولانا کی ادبی زندگی کی ابتدا شعر و سخن سے ہوئی۔ فطرت کی طرف سے وُہ شعر کا نہایت صحیح مذاق لے کر پیدا ہوئے تھے۔ سید جعفر علی مرحوم کی شاگردی نے اس میں اور چار چاند لگا دیے۔ اس زمانہ میں جو کچھ مولانا نے کہا وُہ اُسی پُرانی طرز کا تھا جو شروع سے چلی آ رہی تھی۔ اس لیے وُہ سارے کا سارا کلام نہ ہم تک پہنچا۔ نہ مولانا نے پہنچانا چاہا۔ مگر اس سلسلہ میں ہمیں ایک خاص بات کہنی ہے جو عام طور پر معلوم نہیں۔ اور وُہ یہ کہ شعر و سخن کے اس ابتدائی

دَور میں مولانا کا تخلص حالی نہ تھا۔ بلکہ مولانا پہلے "خستہ" تخلّص کیا کرتے تھے۔ "حالی" کا تخلص آپ نے بعد میں اختیار کیا ہے۔ اُس زمانہ کی صرف ایک نظم مولانا کی ہمیں نہایت تلاش کے بعد ملی ہے جو آپ نے ۱۸۵۶ء میں کہی تھی یعنی حصار کی ملازمت کے دوران میں یہ قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سیّدِ مکّی مدنی العربی" پر ایک تضمین ہے۔

دورِ قدیم کی کچھ غزلیات اور قصائد وغیرہ اگرچہ "دیوانِ حالی" میں موجود ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا انتخاب بھی نہایت احتیاط کے ساتھ عمل میں آیا ہے۔ بہر حال اس تضمین کے بعد ۱۸۷۲ء تک ہمیں مولانا کا بہت کم کلام ملتا ہے۔ یہ وُہ زمانہ ہے جب کہ مولانا پنجاب گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں نائب مترجم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انگریزی خیالات سے متاثر ہو کر اسی سنہ میں آپ نے ایک نہایت

نصیحت آمیز کہانی کو سلیس نظم کا جامہ پہنا کر اُس کا نام "جوانمردی کا کام" رکھا۔ یہ ایک دلچسپ انگریزی حکایت کا آزاد ترجمہ ہے اور مدتوں پنجاب کے پرائمری اور مڈل کے کورسوں میں شامل درسیات رہی ہے۔

جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے ۱۸۷۴ء میں شمس العلماً مولوی محمد حسین آزاد نے کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب کے ایما سے لاہور میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مصرع طرح کی بجائے کسی مخصوص مضمون پر شعرا طبع آزمائیاں کیا کرتے تھے۔ برکھارت وہ دلآویز نظم ہے جو سب سے پہلے مولانا نے اس مشہور تاریخی مشاعرے کے لیے لکھی۔

مشاعرے کے دوسرے اجلاس کے لیے "اُمید" مضمون مقرر ہوا۔ مولانا کی مشہور نظم "نشاطِ اُمید" اُسی مشاعرے کی یادگار ہے۔

تیسرے مشاعرے کا مضمون تھا "وطن کی محبت" اس پر مولانا نے مثنوی "حُبِّ وطن" تحریر فرمائی۔ جو مشاعرے میں پڑھے جانے کے بعد ۲۴ اکتوبر ۱۸۷۴ء کے "پنجابی اخبار" لاہور میں چھپی تھی۔

چوتھا مشاعرہ اس مضمون پر تھا کہ "رحم اچھی صفت ہے یا انصاف"؟ مولانا نے اس پر جو نظم لکھی وہ "مناظرۂ رحم و انصاف" کے نام سے مشہور ہے۔

اِن چار مشاعروں میں شریک ہونے کے بعد مولانا آب و ہوا کی ناموافقت کے باعث لاہور سے دہلی تشریف لے آئے یہاں پہنچ کر آپ نے ۱۸۷۵ء میں وہ پُرزور مسدس سپرد قلم فرمائی جو "ننگِ خدمت" کے نام سے مجموعۂ نظم حالی میں موجود ہے "ننگِ خدمت" کے بعد ایک ترکیب بند موسوم بہ "زمزمۂ قیصری" لکھا۔ مسٹر ایسٹوک ایک انگریز تھے۔ انہوں نے ملکہ معظمہ وکٹوریہ

کے لقب "قیصرۂ ہند" اختیار کرنے کے موقع پر جس کا جشن
لارڈ لٹن کے زمانہ میں یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو سارے
ہندوستان میں بڑی شان سے منایا گیا تھا۔ ایک انگریزی
نظم لکھی تھی۔ مسٹر ایسٹوک نے اس انگریزی نظم کا اُردو
نظم میں ترجمہ کروانا چاہا۔ مولانا حالی اُس وقت دہلی عربک
سکول میں مدرس تھے۔ مسٹر ایسٹوک نے کرنل ڈیوس
کمشنر دہلی سے کہا کہ وُہ اس نظم کا ترجمہ مولانا سے اُردو نظم
میں کروادیں۔ کرنل ڈیوس نے مولانا سے درخواست کی
اور مولانا نے اُسے قبول فرما کر کام شروع کر دیا۔ پوری نظم
انگریزی میں تین حصّوں پر منقسم تھی۔ مگر ابھی مولانا صرف
پہلے ہی حصّے کو اُردو نظم کے سانچہ میں ڈھال نے پائے تھے
کہ مسٹر ایسٹوک کی رائے اُردو ترجمہ کے متعلق بدل گئی۔
اور اُنھوں نے کہا کہ بجائے اُردو کے فارسی نظم میں اس کا

ترجمہ ہونا چاہیئے۔ مولانا کچھ بیمار بھی تھے اور فطرتاً بھی اُن کا دل اس نظم سے متنفر تھا۔ کیونکہ انگریز ناظم نے اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کو اس لیے بہت کچھ بُرا بھلا کہا تھا کہ لوگ انگریزی راج کی قدر کریں۔ غرض مولانا نے اپنی بیماری اور ناسازیٔ طبع کا عذر کر کے اس نظم سے پیچھا چھڑایا۔ مجبوراً مسٹر ایسٹوک نے فارسی کے بعض دُوسرے اساتذہ سے یہ کام کرایا۔

اس کے بعد جو اہتم بالشان کام مولانا نے کیا وُہ مسدس حالیؔ کی تصنیف ہے۔ یہ وُہ بے نظیر اور لاجواب نظم ہے جو بزمانۂ قیام دہلی مولانا نے سرسید کی فرمائش پر لکھی۔ یہ نظم شہرت کے پر لگا کر اُڑی اور چار دانگ عالم میں حالیؔ کا نام پکار آئی۔ اگر حالیؔ مسدس کے سوا اور کچھ بھی نہ لکھتے تو یہ مسدس اُن کے نام کو بقائے دوام بخشنے کے لیے

کافی تھی۔ اس کا پورا نام "مسدس مدوجزرِ اسلام" ہے اور یہ ماہ جون ۱۸۷۹ء مطابق جمادی الثانی ۱۲۹۶ھ میں مطبع سے چھپ کر نکلی اور نکلتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔ سرسید اُس وقت شملہ میں تھے۔ چار جلدیں تحفۃً اُن کے پاس بھی پہنچیں۔ دیکھتے ہی پھڑک اُٹھے اور جب تک ساری نظم ختم نہ کرلی اپنی جگہ پر سے نہ اُٹھے۔ اس عجیب وغریب تحفہ کی رسید میں جو خط مولانا کو سرسید نے لکھا۔ اس میں مسدس کی بے حد تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام معززین شہر کو مدعو کروں۔ ساتھ ہی چند طوائفوں کو بھی بلواؤں، جو مسدس کے بند اُس محفل میں گاکر سُنائیں۔

مسدس کا دوسرا ایڈیشن مولانا نے ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء میں چھپوایا۔ پہلا اور دوسرا دونوں ایڈیشن بلا ضمیمہ تھے۔ تیسرا ایڈیشن

۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء میں مولانا نے شائع کیا۔ اس میں اصل مسدّس میں جستہ جستہ تصرّف کرنے کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی ملحق کیا گیا تھا۔

اُس وقت سے لے کر اب تک بلا مبالغہ مسدّس کے سینکڑوں ہی ایڈیشن شائع ہو کر فروخت ہو چکے ہیں۔ جن میں سے بعض بہت اعلیٰ اور نفیس تھے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اُردو لٹریچر کے تمام گذشتہ دور میں کسی بھی کتاب کو مسدّس جیسی شہرت اور قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

مسدّس کی تصنیف کے بعد ۱۸۸۰ء میں مولانا نے ایک مشہور ترکیب بند "مدرسۃ العلوم مسلمانان" کے نام لکھا۔ جس میں علیگڈھ کے مدرسہ کی طرف جسے سر سید نے قائم کیا تھا، اور جو اب مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے قوم کو توجہ دلائی تھی۔ مثنوی "تعصّب و انصاف" ۱۸۸۲ء کی اور مثنوی "کلمۃ الحق"

و" مناظرہ واعظ و شاعر" ۱۸۸۳ء کی تصنیف ہیں۔

مشہور ترکیب بند "شکوۂ ہند" غالباً ۱۸۸۶ء میں مولانا نے لکھا تھا۔ یہ مسدّس حالی کے رنگ کی ایک چیز ہے۔ جس میں قوم شاندار ماضی کا حسرتناک تذکرہ نہایت دردانگیز پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

"مناجاتِ بیوہ" بھی ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۷ء کی تصنیف ہے۔ یہ بے نظیر نظم مولانا کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ اور مولانا کو خود بھی اس پر بجا ناز تھا۔ آج تک کوئی شخص ہندوستان کی بدنصیب اور نامراد بیوہ کے جذبات و خیالات کو اس روانی و خوبصورتی کے ساتھ نظم نہیں کر سکا تھا جیسا مولانا نے کیا۔ مسدّس کے بعد شہرت کے لحاظ سے اگرچہ مناجات بیوہ کا درجہ دوسرا ہے۔ مگر زبان کی سلاست مصرعوں کی بندش اور خیالات کی روانی اور پھر اثر اور درد کے لحاظ سے مسدّس

اِس مثنوی تک مشکل ہی سے پہنچ سکتی ہے۔ دس سے زیادہ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اُس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

۱۸۸۷ء یا ۱۸۸۸ء میں مولانا نے وہ معرکۃ الآرا مثنوی رقم فرمائی جو "حقوقِ اولاد" کے نام سے شہرت رکھتی ہے۔ اور جس میں والدین کو اولاد کے متعلق اُن کے فرائض نہایت عمدگی کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔

"جشنِ جوبلی" کے عنوان سے ایک نظم مولانا نے ۱۸۸۷ء کی ابتدا میں لکھی تھی۔ جب کہ ملکۂ وکٹوریہ کو سلطنت کرتے پچاس سال ہو چکے تھے اور اس خوشی میں ایک زبردست جشن بعہد لارڈ کرزن ۱۸ فروری ۱۸۸۷ء کو سارے ہندوستان میں منایا گیا تھا۔ یہ نظم انجمن اسلامیہ لاہور کے ایڈریس کے ساتھ انجمن کی طرف سے ملکۂ معظمہ کے حضور میں پیش کی گئی تھی۔

۱۸۸۹ء میں "مسلمانوں کی تعلیم" کے عنوان سے ایک ترکیب بند محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے اجلاس میں بمقام علیگڈھ مولانا نے پڑھ کر سنایا تھا۔

اکتوبر ۱۸۹۰ء میں مولانا نے اپنی چودہ متفرق نظمیں (جن میں اکثر کا ذکر اوپر آچکا ہے) "مجموعۂ نظمِ حالی" کے نام سے پہلی مرتبہ یکجا طور پر شائع کیں۔ ان نظموں کے عنوانات حسب ذیل تھے:۔

۱ برکھارت۔ ۲ نشاطِ امید۔ ۳ حبِ وطن۔ ۴ مناظرہ رحم وانصاف۔ ۵ ننگ خدمت۔ ۶ مدرستہ العلوم مسلمانان۔ ۷ تعصب وانصاف۔ ۸ کلمۃ الحق۔ ۹ مناظرہ واعظ وشاعر۔ ۱۰ جشن جوبلی۔ ۱۱ جھوٹ اور ایکے کا مناظرہ۔ ۱۲ تعلیم مسلمانان۔ ۱۳ جواں مردی کا کام۔ ۱۴ زمزمۂ قیصری۔

۱۸۹۱ء کے ماہ دسمبر میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چھٹا اجلاس علیگڈھ میں منعقد ہوا۔ جس میں مولانا نے اپنا اُردو ترکیب بند پڑھ کر سنایا جس میں متوسط درجے کے لوگوں کی حالت کو

فقرا اور اغنیا دونوں کی حالت سے بہتر بنایا گیا ہے۔

۱۸۹۲ء میں شمالی ہند کے نہایت نامور طبیب حاذق الملک حکیم محمود خاں کا انتقال ہو گیا۔ مولانا نے جو پُر زور اور بےنظیر مرثیہ مسدّس کے طور پر اُن کا لکھا۔ اس میں کمال کر دکھایا۔ دراصل یہ اکیلے محمود خاں کا ہی مرثیہ نہیں بلکہ دہلی کے علوم و فنون اور مسلمانوں کے تنزل و ادبار کی نہایت خطرناک اور پُر درد داستان ہے۔ ایک ایک لفظ اثر اور درد و غم میں ڈوبا ہُوا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں مولانا نے بڑی نفاست اور خوش اسلوبی کے ساتھ اپنا دیوان جو جدید اصلاح شدہ شاعری کا بہترین نمونہ تھا، دہلی کے مشہور خوشنویس جناب مولوی محمد دین صاحب سے لکھوا کر نامی پریس کانپور میں طبع کرایا۔ یہ چھاپہ خانہ عمدگی طباعت کے لحاظ سے ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

دیوانِ حالی دراصل دیکھنے اور پڑھنے کی چیز ہے۔ مقدمہ کو علیحدہ رکھ کر جو نثر میں ہے صرف دیوان ۲۳۲ صفحات کا ہے۔ جس میں سب سے اوّل قطعات ہیں۔ جن کی تعداد ۶۷ ہے۔ اس کے بعد قدیم اور جدید غزلیات ہیں۔ پھر ایک سو سات (۱۰۷) رباعیات ہیں اور سب سے آخر میں کچھ متفرق کلام ہے۔

دیوان کے شائع کرنے کے بعد بعض عوارض اور مختلف مکروہات کے باعث مولانا کو عرصہ تک شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور سنہ ۱۹۰۱ء تک ہمیں آپ کی کوئی جدید غزل یا نظم نہیں ملتی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ کا اجلاس رام پور میں منعقد ہوا تھا۔ اُس وقت آپ نے جلسہ کے لیے ایک نظم لکھنی شروع کی۔ مگر انہی مکروہات کی وجہ سے عین وقت تک مکمل نہ ہو سکی اور اسی ناتمام حالت میں بطور تبرّک جلسہ میں پڑھی گئی۔ اس نظم کا عنوان

"شکریہ والیٔ رامپور" ہے۔

۲۱ جنوری ۱۹۰۱ء کو ملکۂ وکٹوریہ کا لندن میں انتقال ہوگیا۔ انگلستان اور ہندوستان دونوں میں بڑا ماتم کیا گیا جو حقائق و واقعات سے پُر اور جذب واثر سے لبریز ہے یہ مرثیہ بہت عمدہ کاغذ پر انگریزی ترجمہ کے ساتھ آپ نے شائع فرمایا۔

"تحفۃ الاخوان" مولانا کی نہایت مشہور نظم ہے جو آپ نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سولھویں اجلاس میں ۲ جنوری ۱۹۰۳ء کو خود سُنائی۔

کانفرنس مذکور کے سترھویں اجلاس کے لیے جو دسمبر ۱۹۰۳ء میں منعقد ہوا تھا، آپ نے ایک بے نظیر ترکیب بند تحریر فرمایا تھا اور جلسہ میں اُسے خود ہی سُنایا۔ اُس کا عنوان "فلسفۂ ترقی" ہے۔

اپریل ۱۹۰۴ء میں آپ نے "انجمن حمایتِ اسلام لاہور" کے لیے ایک نہایت پُرزور اور لاجواب ترکیب بند لکھا جو اس کے سالانہ جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔

"چُپ کی داد" وہ آخری اور مشہور و معروف مستقل نظم ہے جو آپ نے عورتوں کی خدمتوں اور مصیبتوں کے متعلق ۱۹۰۵ء میں تحریر فرمائی۔ عورتوں کی مظلومیت کی داستان ایسی پُراثر اور حقیقی طرز پر شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

۱۹۱۱ء میں جب اعلیٰحضرت حضور نظام میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ کا جشنِ تاجپوشی منعقد ہوا، تو آپ نے اُس وقت جو تہنیت نامہ رقم فرمایا۔ وُہ بلاشبہ ہمارے شعرا کے لیے ایک مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتا ہے خوشامد اور چاپلوسی کا اس میں نام و نشان بھی نہیں اور ہر شعر واقفیت اور حقیقت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔
اب مولانا کی عمر کا وُہ زمانہ تھا کہ قوی میں انحطاط اور جسم میں

کمزوری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ویسے بھی پریشانیاں لاحق رہتی تھیں۔ اس لیے فکرِ شعر کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا۔ چار پانچ غزلیں۔ تین یا چار متفرق نظمیں اور پچاس سے زیادہ رباعیاں اس دور کی یادگار ہیں اور بس!

آپ کے سب سے آخری اشعار غالباً اُن تین رباعیات کی شکل میں ہیں جو مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے عظیم الشان تاریخی ہنگامے کے متعلق آپ نے تحریر فرمائی تھیں اور جو مولوی محمد علی مرحوم کے روزنامہ ہمدرد دہلی کے ۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے پرچہ میں شائع ہوئی تھیں۔

دیوانِ حالی کے شائع ہونے کے بعد جو کچھ مولانا نے کہا تھا اور جو پراگندہ اور منتشر حالت میں مختلف اخباروں اور رسالوں میں بکھرا پڑا تھا یا غیر مطبوعہ اور قلمی حالت میں تھا۔ وہ جتنا مل سکا۔ میں نے تلاش کر کے ۱۹۲۲ء میں "جواہراتِ حالی" کے نام سے شائع کر دیا۔ مگر عرصہ ہوا کہ یہ کتاب فروخت ہو چکی اور اب نایاب ہے۔

منظوم تصانیف کا تذکرہ ہو چکا اب ہم مولانا کی نثر تصانیف کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ مولانا کی نثر تصانیف مختلف قسموں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں:۔

ا۔ وہ تصانیف جو عام طور پر بازاروں میں ملتی اور کتب فروشوں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ بار بار چھپتی ہیں اور فروخت ہو جاتی ہیں۔

ب۔ وہ تصانیف جو ابتدا میں ایک دفعہ مولانا نے شائع کیں مگر اب ناپید اور نایاب ہیں اور ڈھونڈے سے بھی کہیں

نہیں ملتیں۔

ج۔ مولانا کی وہ تصانیف جو آپ کے انتقال کے بعد شائع ہوئیں۔

د۔ وہ تصانیف جو غیر مطبوعہ نسخوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ مگر ابھی تک اُن کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

ھ۔ وہ تصانیف جن کے غیر مکمل قلمی مسودے موجود ہیں مگر اُن کی تکمیل کی مہلت مولانا کو نہیں ملی۔

و۔ وہ بیسیوں نثر مضامین جو مختلف موضوعوں پر مولانا نے وقتاً فوقتاً ملکی جرائد و رسائل میں لکھے۔

ز۔ اُن کتابوں کا تذکرہ جن کو مرتّب اور مدوّن کرنے کا مولانا کا ارادہ تھا۔ مگر مکروہات اور عدیم الفرصتی وغیرہ موانع کی وجہ سے ارادہ عمل کا قالب اختیار نہ کر سکا۔

ح۔ کم از کم ایک کتاب مولانا کی ایسی بھی ہے جو

اگرچہ مکمل لکھی گئی تھی، مگر تلف ہوگئی۔ اور اب دنیا کو اس کا نام بھی معلوم نہیں۔

اب ہم نمبروار ہر قسم کی تصانیف کے متعلق بہت مختصر طور پر کچھ تفصیلات پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ وہ تصانیف جو عام طور پر ملتی ہیں

۱۔ مجالس النساء۔ یہ بے نظیر کتاب مولانا نے ۱۸۷۴ء میں دو حصّوں میں تصنیف فرمائی تھی۔ اس میں ایک دلچسپ قصّہ کے پیرائے میں عورتوں کو امورِ خانہ داری۔ اصلاحِ معاشرت۔ حُسنِ اخلاق۔ تحصیلِ علم۔ حسنِ انتظام۔ بچوں کی پرورش و اُن کی تعلیم و تربیت۔ آپس کے تعلقات کے آداب۔ بچیوں کو خراب عادتوں اور بُری خصلتوں سے باز رکھنے کی تدابیر۔ لڑکیوں کو کھانا پکانے۔ سینے پرونے۔ پڑھنے لکھنے ہنر و

سلیقہ حاصل کرنے کے ڈھنگ۔ اور مستورات میں رائج شدہ
بُری رسوم۔ باطل توہمات اور فضول اور لایعنی تقریبات کا
بیان ایسی خوبی اور سلاست کے ساتھ کیا ہے کہ ہر بات
کی بُرائی بھلائی دل میں بیٹھتی چلی جاتی ہے۔ امور خانہ داری
کے متعلق یہ ایک نہایت مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ مدّت
تک پنجاب اور یوپی کے زنانہ سرکاری مدرسوں میں داخلِ
نصاب رہی۔ پنجاب میں تو اب بھی کہیں کہیں پڑھائی
جاتی ہے۔

کتاب کا طرزِ بیان نہایت شگفتہ۔ شستہ اور دلفریب
ہے۔ ایک بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ پڑھتے ہوئے بالکل
یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کسی عورت کی تصنیف ہے جس نے
اُسے خاص نسوانی محاورات اور دہلی کی زبان میں لکھا ہے۔
دہلی میں ایک تعلیمی دربار کے موقع پر لارڈ نارتھ بروک نے

مولانا کو اس تصنیف پر چار سو (۴۰۰) روپے انعام بھی مرحمت فرمایا تھا۔ اُس ابتدائی حالت میں یہ چار سو روپے کا انعام بہت بڑا اعزاز سمجھا گیا تھا۔

عرصہ تک تو یہ کتاب داخلِ درس رہی۔ مگر جیسا کہ قاعدہ ہے۔ نئی نئی کتابوں کے شائع ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اِس کی طرف سے توجہ ہٹتی گئی اور اُسکی جگہ دُوسری نوتصنیف کتابوں نے لے لی۔ جب تک داخلِ درس رہی چھپتی اور بکتی رہی۔ جب شاملِ نصاب نہ رہی تو چھپنی بھی بند ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ناپید اور نایاب ہوگئی۔ آخر ۱۹۲۵ء میں مخدومی خواجہ سجّاد حسین صاحب کی طرف سے یہ پھر شائع ہوئی۔ بعد میں رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشر لاہور نے بھی اس کو چھوٹی سرکاری تقطیع پر چھاپا اور آج کل عام طور سے ملتی ہے۔

۲۔ حیاتِ سعدی ۔ شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ نہایت مکمل مفصل اور مبسوط سوانح عمری ہے جس میں اُن کے سوانحی حالات بیان کرنے کے بعد اُن کے نظم و نثر کلام اور تصانیف پر نہایت بسیط تنقید کی گئی ہے۔ یقیناً اُردو میں سعدی کی کوئی اتنی عمدہ اور محققانہ سوانح عمری موجود نہیں جیسی کہ یہ ہے۔ یہ کتاب غالباً مولانا نے ۱۸۸۴ء میں شائع کی تھی۔ دوسری مرتبہ ۱۸۸۷ء میں چھپی اور تیسری دفعہ ۱۸۸۸ء میں۔ بس یہ کتاب صرف تین مرتبہ مولانا نے بطور خود شائع کی ہے اور تینوں مرتبہ اسکی تقطیع مولانا نے $\frac{18 \times 22}{8}$ رکھی تھی۔ اس کے بعد یہ کتاب چوتھی مرتبہ ۱۸۹۶ء میں مدرستہ العلوم علیگڈھ کی طرف سے $\frac{20 \times 26}{8}$ تقطیع پر چھپی۔ مگر یہ ایڈیشن نہایت خراب اور ردّی کاغذ پر ہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء تک اس کے دس بارہ ایڈیشن شائع ہوئے اور اب تک شاید

تینس ۳۳ بتیس ۳۲ مرتبہ چھپ چکی ہوگی۔

۳۔ مقدمہ دیوانِ حالی۔ فنِ شعر پر یہ ایک اعلیٰ درجہ کا فلسفیانہ اور محققانہ ریویو ہے جس میں مولانا نے عام مروّجہ شاعری کے نقائص ایک ایک کر کے تفصیل کے ساتھ بتائے ہیں۔ اہلِ ذوق حضرات اور سخن فہم اصحاب نے اس کتاب کو فنِ شعر پر بہترین اور بے مثل کتاب مانا ہے۔ یہ مقدمہ دیوانِ حالی کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہُوا۔ مگر اتنی اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہوتے ہوئے بھی مولانا کی زندگی میں اُسے دوبارہ چھپنا نصیب نہیں ہُوا۔ لیکن آپ کے انتقال کے بعد جبکہ یہ ملک کے متعدد صوبوں میں داخلِ نصاب کر لیا گیا تو سنہ ۱۹۲۰ء میں اس کا دُوسرا ایڈیشن الناظر بک ایجنسی لکھنؤ کی طرف سے مولوی ظفر الملک علوی نے شائع کیا اور اُس کے بعد سے اب تک متعدد مطابع اُسے چھاپ چکے ہیں۔

۴۔ **یادگارِ غالب**۔ دورِ آخر کے نامور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مبسوط سوانح عُمری ہے۔ مفصّل سوانحی حالات۔ مرزا کی نظم و نثر تصنیفات کی مکمل فہرست۔ ہر ایک کتاب کی مفصّل کیفیت۔ غالب کے اُردو اور فارسی نظم و نثر کلام پر عالمانہ تبصرہ اور اُن کے مشکل اشعار کی بے نظیر شرح۔ یہ ہیں یادگارِ غالب کے مضامین۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ مولانا نے ۱۸۹۷ء میں ۴۰۴ صفحات پر نامی پریس کانپور سے چھپوا کر شائع کی۔ شروع میں غالب کی ایک دستی تصویر بھی شامل تھی۔ جو نہایت صفائی اور نفاست کے ساتھ بنائی گئی تھی۔ یہ ایڈیشن اب بالکل ناپید ہے۔ مگر دُوسرے لوگوں نے اسے بکثرت چھاپا ہے اور اب یہ کتاب عام طور سے دستیاب ہوتی ہے۔

۵۔ **حیاتِ جاوید**۔ یہ ضخیم کتاب سرسیّد کے تعلیمی اصلاحی

اور مذہبی کارناموں کی سب سے بڑی تفصیل ہے جس میں سرسید کا ایک ایک کارنامہ۔ اُن کی زندگی کے ہر دور کے حالات۔ اُن کے اخلاق اور سیرت کے متعلق تفصیلی بیانات اور مسلمانوں کو اُن کی ذات سے جو جو فوائد پہنچے اُن کی تفصیل اس عمدگی اور خوبی کے ساتھ تحریر کی گئی ہے کہ پڑھ کر ہیرو کی قومی خدمت کی وقعت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ مولانا نے یہ لائف لکھ کر اُردو زبان میں یورپین طرز پر سیرت نگاری کا اہلِ قلم کو ایک صحیح رستہ بتایا ہے۔ یہ کتاب یورپین سیرت نگاری کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے حیاتِ جاوید سے پہلے اس قسم کا کوئی نمونہ اُردو زبان میں موجود نہیں تھا۔ جو ہماری زبان کے مصنّفوں اور مؤلّفوں کی اس فن میں رہنمائی کرتا۔ بعد کے زمانہ میں جتنی اعلیٰ درجہ کی سوانح عمریاں لکھی گئیں سب نے اِسی کا تتبع کیا۔

کامل چھ برس کی محنت۔ تلاش اور تحقیق کے بعد مولانا نے

نہایت نفاست کے ساتھ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں نامی پریس کانپور سے چھپوا کر شائع کی۔ کتاب تین قسم کے کاغذ پر چھاپی گئی تھی۔ قسم اوّل کی قیمت عہ۱۲/۸ ۔ قسم دوم کی صہ۵/۸ اور قسم سوم کی للحہ۴ تھی۔ کتاب کے کل ۱۰۰۲ صفحات بہ تفصیل ذیل تھے۔ ٹائیٹل و فہرست مضامین ۱۲۔ حصّہ اوّل ۳۲۰۔ حصّہ دوم ۵۵۸۔ انڈیکس ۲۰۔ ضمیمہ جات ۹۲۔ کل میزان ۱۰۰۲ صفحات۔ ۹۲ صفحات پر پانچ ضمیمے حسب ذیل عنوانات پر مشتمل تھے:—

۱۔ ضمیمہ اوّل سر سیّد کا نسب نامہ

۲۔ ضمیمہ دوم۔ سر سیّد کی تصنیفات کی مکمل فہرست

۳۔ ضمیمہ سوم۔ سر سیّد کے چند خواب

۴۔ ضمیمہ چہارم۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ غدر ۱۸۵۷ء کے اسباب و علل کے متعلق سر سیّد نے یہ رسالہ تصنیف

کیا تھا۔ چونکہ یہ بالکل نایاب ہو گیا تھا۔ لہٰذا مولانا نے بطورِ ضمیمہ اُسے دوبارہ شائع کر دیا۔

۵۔ سر سیّد کی تفسیر القرآن کے متعلق مولانا کا ایک تنقیدی مضمون۔ جو اس سے پہلے رسالہ معارف علیگڈھ میں چھپ چکا تھا۔

حیاتِ جاوید کا یہ ایڈیشن اگرچہ توقع کے موافق نہیں مگر خیر دو ڈیڑھ سال میں قریباً سارا فروخت ہو گیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۰۳ء میں مولانا نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا مگر اس میں قیمت کی کفایت کے خیال سے انڈکس اور ضمیمے اُڑا دیے۔ اصل کتاب میں بھی کہیں کہیں زیادہ طویل عبارتوں کو حذف کر دیا گیا۔ قلم بھی خفی کر دیا اور اس طرح ۲۰۰ صفحات سے کم ہو کر کتاب کا حجم ۷۱۶ صفحات کا رہ گیا۔

یہ دُوسرا ایڈیشن آہستہ آہستہ فروخت ہوتا رہا اور مولانا کو اپنی زندگی میں اس کتاب کو سہ بارہ چھپوانے کی ضرورت نہ پڑی۔ لیکن آپ کے انتقال کے بعد پہلی اور دُوسری دفعہ کے دونوں ایڈیشن نایاب اور ناپید ہوگئے اور اخباروں میں شوقین اصحاب نے اشتہار دینے شروع کیے کہ "حیاتِ جاوید کے پہلے ایڈیشن کی ضرورت ہے۔" نتیجہ یہ ہُوا کہ بیس بیس اور پچیس پچیس روپے جیسی حقیر رقوم کے بدلے اُن لوگوں نے جو ادب سے ذرا بھی مس نہ رکھتے تھے یہ ایڈیشن فروخت کر ڈالا اور اب کہیں ڈھونڈے نہیں مِلتا۔

جب ملک میں ادب اُردو کی ترقّی اور وسعت کے ساتھ کتاب مذکور کی مانگ بہت بڑھ گئی اور کتاب ناپید ہوگئی۔ تو آخر مسلم یونیورسٹی بکڈپو علیگڈھ کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں یہ کتاب سہ بارہ چھپی۔ مگر اس ہیئت کے ساتھ کہ ذوقِ سلیم

نے دیکھتے ہی سر پیٹ لیا۔

ب۔ نایاب تصانیف

۱۔ تریاقِ مسموم۔ پانی پت کا رہنے والا ایک شخص عماد الدین نامی آگرہ میں جا کر عیسائی ہو گیا۔ چونکہ کچھ پڑھا لکھا تھا۔ لہٰذا مذہب اسلام کے خلاف کتابیں لکھنی شروع کیں۔ یہ کتاب اسی پادری عماد الدین کی تصنیف "تحقیق الایمان" کا جواب ہے۔ جو مولانا نے ۱۸۶۸ء میں لکھا اور اُسی زمانہ میں دہلی کے ایک ماہوار رسالہ "خیر المواعظ" میں باقساط چھپا۔ یہ کتاب مولانا نے دو حصّوں میں لکھی تھی۔ مگر غالبًا رسالہ میں پوری کتاب نہیں چھپ سکی اور علیحدہ بھی شائع نہیں ہوئی۔ اب قطعًا ناپید ہے۔ اس کے کچھ متفرق اوراق بصد تلاش میں حاصل کر سکا۔

۲۔ تاریخ محمدیؐ پر منصفانہ رائے ۔ "تاریخ محمدیؐ" نامی ایک کتاب اسی پادری عماد الدین نے لکھی تھی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نہایت رکیک الزامات لگائے گئے ہیں۔ مولانا نے اس کتاب پر ایک تنقید لکھی جو "تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے" کے نام سے ۱۸۷۱ء یا ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی اب کہیں نہیں ملتی۔

۳۔ علم طبقات الارض ۔ اس کتاب کو مولانا نے بزمانہ قیام لاہور ایک عربی کتاب سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ عربی کتاب بھی ایک فرنچ تصنیف کا ترجمہ تھی۔ یہ ترجمہ مولانا نے غالباً ۱۸۶۸ء میں کیا تھا۔ آپ نے اس ترجمہ کو پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا تھا جس نے اسے ڈاکٹر لائٹنر کے عہد میں چھپا کر شائع کر دیا تھا۔ مولانا کا اپنا بیان اس کتاب کے متعلق یہ ہے کہ اوّل تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی

تھی جب کہ جیولوجی (علم طبقات الارض) کا علم ابتدائی حالت
میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی۔ اس لیے
اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے"۔

۴۔ سوانح عمری حکیم ناصر خسرو۔ حکیم ناصر خسرو علوی
بلخ کا رہنے والا ایک مشہور سیاح تھا۔ جس نے چوتھی صدی
ہجری میں ایران۔ آرمینیا۔ شام۔ فلسطین۔ عراق۔ عرب۔
اور مصر کا طویل سفر کر کے فارسی زبان میں سب سے پہلے سفر نامہ
لکھا۔ اُس کا یہ سفر سات برس میں مکمل ہوا۔ یہ سفر نامہ جو
اب آٹھ نو سو برس پہلے کی فارسی زبان کا ایک اچھا نمونہ تھا۔
قطعاً نایاب اور نادر الوجود تھا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں
رخشاں دہلوی کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود
تھا۔ فرانس کے نامی مصنف چارلس شیفر کو اس کا پتہ لگا۔ تو
اُس نے گورنمنٹ ہند کی معرفت نواب صاحب کے کتب خانہ

سے مستعار منگایا اور فرنچ ترجمہ کے ساتھ اس کو بڑی شان
سے شائع کیا۔ جب نسخہ واپس آیا تو مولانا کو بھی جو اُس وقت
اینگلو عربک سکول میں مدرس اوّل السنہ مشرقیہ تھے اسے
ہندوستان میں شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ پہلے تو مولانا
نے سوچا کہ اسے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا جائے لیکن
بعد میں اس خیال سے کہ چونکہ سفرنامہ مذکور قدیم فارسی کا
ایک بہترین نمونہ ہے (اور اُس وقت تک فارسی ادب
اور زبان کا ذوق بھی ہندوستان میں بالکل مفقود نہیں ہوا
تھا) مولانا نے اس کو اصل فارسی ہی میں شائع کرنا مناسب
سمجھا۔ مگر اس کے ساتھ مولانا نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ حکیم
موصوف کی مفصل اور مکمل سوانح عمری جس پر تاریکیوں اور
غلط بیانیوں کے بہت سے بادل چھائے ہوئے تھے، نہایت
تلاش و تحقیق کے ساتھ فارسی زبان میں مرتّب کی اور سفرنامہ

کے شروع میں لگا دی۔ یہ دونوں چیزیں یعنی سوانح عمری اور
سفرنامہ ۱۸۸۲ء میں دہلی کے مطبع خیر خواہ ہند میں چھپ کر
شائع ہوئیں۔ سوانح عمری ۳۲ صفحوں پر ہے اور اصل سفرنامہ
۱۳۶ صفحات پر۔ آج کل یہ سوانح عمری ناپید ہے اور کہیں
نہیں ملتی۔ البتہ سفرنامہ نہایت نفاست کے ساتھ مطبع
کاویانی برلن سے شائع ہو چکا ہے۔

ج۔ وہ کتب جو مولانا کے انتقال کے بعد شائع ہوئیں

۱۔ مولود شریف۔ پرانی طرز اور قدیم روایات کو لیے
ہوئے یہ مولود مولانا نے ۱۸۶۴ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان
کسی وقت لکھا تھا۔ عبارت نہایت مقفیٰ مسجع اور دلچسپ
ہے۔ مگر روایات ساری کی ساری وہی ہیں جو مولود کی پرانی
کتابوں میں بھری پڑی ہیں۔ جگہ جگہ حسب موقع نظمیں بھی ہیں۔

یہ کتاب مولانا نے اپنی زندگی میں نہیں چھپوائی۔ حالانکہ آپ اس کی تالیف کے چالیس پینتالیس سال بعد تک حیات رہے۔ غالباً یہ خیال مانع اشاعت رہا ہوگا کہ جس طرز پر یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ اب متروک ہوتی جارہی ہے۔ اور جو روایات اس میں بیان کی گئی ہیں اب وہ قطعاً ساقط الاعتبار سمجھی جارہی ہیں اور اس حالت میں کتاب کی وہ قدر نہیں ہوگی جو کہ ہونی چاہئے۔ بہرحال ۱۹۲۳ء میں خواجہ فرزند علی صاحب نے پانی پت میں ایک پریس قائم کیا، تو مخدومی خواجہ سجاد حسین صاحب نے سب سے پہلے یہی کتاب اس میں شائع کرائی۔ جس کا قلمی مسودہ خود مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خواجہ صاحب ممدوح کے پاس محفوظ تھا۔ کتاب $\frac{18 \times 22}{8}$ کی تقطیع پر ہے اور اس کے ۹۶ صفحات ہیں۔

۲۔ مکتوبات حالی یعنی وہ مختلف خطوط جو مولانا نے

مختلف اوقات میں اپنے عزیزوں۔ دوستوں۔ بزرگوں اور ملنے والوں کو لکھے۔ انشا پردازی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ یہ خطوط مولانا کی لائف کے متعلق ایسی بہت سی باتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جو اس سے پہلے عام طور پر معلوم نہیں تھیں۔ اور اگر یہ خطوط کا مجموعہ شائع نہ ہوتا، تو شاید کبھی معلوم نہ ہوتیں۔ مخدومی جناب خواجہ سجّاد حسین صاحب کی زیر ہدایت میں نے ان خطوط کو عرصہ کی محنت میں جمع اور مرتب کیا اور ۱۹۲۵ء میں یہ مجموعہ دو جلدوں میں حالی پریس پانی پت سے چھپ کر شائع ہوا۔ پہلی جلد کے ۴۰۷ صفحات ہیں اور دوسری جلد کے ۴۵۷۔ جلد دوم میں صرف خان بہادر خواجہ تصدق حسین مرحوم سشن جج اور مخدومی خواجہ سجّاد حسین صاحب کے نام کے خطوط ہیں۔ اور جلد اوّل میں مندرجہ ذیل اصحاب کے نام:۔

(۱) وقار الملک نواب مشتاق حسین مرحوم امروہوی

(۲) (نواب صدر یار جنگ) مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور

(۳) خان بہادر شمس العلماء مولانا محمد ذکاء اللہ صاحب مرحوم دہلوی

(۴) مولوی عبدالرحیم خاں صاحب بیدل دہلوی

(۵) سید علی حسن صاحب ممبر کونسل ریاست اندور

(۶) مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے۔ سکرٹری انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن

(۷) آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی

(۸) راجہ جہاں داد خاں صاحب چیف آف گکھڑ

(۹) خواجہ اخلاق حسین صاحب (مولانا کے پوتے ہیں)

(۱۰) خواجہ عبدالولی صاحب (مولانا کے نواسے)

(۱۱) سید فیاض حسین صاحب مرحوم

(۱۲) مولوی احسن اللہ خاں صاحب پروفیسر عربی و فارسی وکٹوریہ کالج

گوالیار۔ مدیر قند پارسی

(۱۳) منشی محمود احمدؐ صاحب عبّاسی سپرنٹنڈنٹ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

(۱۴) حافظ محمد یعقوب صاحب مجدّدی مرحوم

(۱۵) مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مجدّدی

(۱۶) مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی وکیل غازی آباد

(۱۷) حافظ سعد اکبر صاحب عثمانی مرحوم

(۱۸) حافظ محمد صدیق اکبر صاحب عثمانی مرحوم

(۱۹) مولوی محمد راغب اللہ صاحب مرحوم

(۲۰) میر ضامن علی صاحب ذیلدار سونی پت (ضلع رہتک)

(۲۱) خواجہ محب علی صاحب مرحوم

(۲۲) خواجہ غلام عباس صاحب مرحوم (والد آنریبل خواجہ غلام الثقلین)

(۲۳) مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب (برادرِ اکبر آنریبل خواجہ غلام الثقلین)

(۲۴) صاحبزادگان خواجہ غلام عباس صاحب مرحوم

(۲۵) خواجہ اخلاق حسین صاحب (فرزندِ اکبر مولانائے مرحوم)

(۲۶) اہلیہ مرحومہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم (دختر مولوی خواجہ اخلاق حسین مرحوم)

(۲۷) نیاز محمد صاحب وکیل جالندھر

(۲۸) لالہ چندولال صاحب فرزند لالہ بہاری لال مشتاق (شاگرد مولانائے مرحوم)

(۲۹) خواجہ فرزند علی صاحب (مولانا کے نواسے ہیں)

(۳۰) اہلیہ خواجہ سجاد حسین صاحب

(۳۱) مولوی عبدالعلی صاحب مرحوم

(۳۲) منشی محمد کرم اللہ خاں صاحب مرحوم دہلوی (عرف ننھے خاں)

(۳۳) مولوی محمد عنایت اللہ صاحب بی اے (فرزند شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ)

(۳۴) مولوی احمد بابا مخدومی مرحوم

(۳۵) آنریری سکرٹری مدرسۃ العلوم علیگڈھ (غالباً نواب محسن الملک مرحوم)

(۳۶) خواجہ لطیف احمد بی اے (ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ محمڈن ہائی سکول امراؤتی)

(۳۷) ایک (نامعلوم الاسم) عزیز کے نام

کُل خطوط کی تعداد ۲۴۷ ہے۔

اِس مجموعہ کے شائع ہونے کے بعد بھی ہم نے مولانا کے اور بہت سے خطوط جو علمی اور ادبی مباحث سے پُر ہیں نہایت تلاش سے جمع کیے ہیں۔ دیکھیے اُن کی اشاعت کی نوبت کب آتی ہے۔

د۔ غیر مطبوعہ تصانیف

اس سلسلہ میں مجھے صرف ایک رسالہ کا پتہ چل سکا ہے۔ جس کا مسودہ خود مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے اس کا نام "شواہد الالہام" ہے۔ مختصر رسالہ ہے مگر نہایت جامعیت اور سلاست کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس میں مولانا نے عقلی دلائل سے نبوت اور الہام کی ضرورت کو ثابت کیا ہے۔ آجکل کے دورِ الحاد میں ضرورت ہے کہ اس کی ہزاروں کاپیاں چھپوا کر فلسفۂ مغرب کے دلدادگان میں مفت تقسیم کی جائیں۔ کیونکہ یہ گروہ عقلی دلائل ہی سے خاموش ہو سکتا ہے۔ نقلی شواہد اُس پہ کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ نہ معلوم کیوں مولانا نے اپنی حیات میں اس مفید ترین رسالہ کی طبع و اشاعت کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔

۵۔ نامکمل تصانیف کے مسودے

اس عنوان کے ماتحت ہم تین کتابوں کا ذکر کریں گے جن کے متعلق بہت تلاش و تحقیق کے بعد کچھ معلوم کر سکے ہیں:۔

۱۔ **اصول فارسی**۔ فارسی صرف و نحو کی یہ کتاب دو جلدوں میں پنجاب کے سرکاری مدرسوں میں پڑھانے کے لیے محکمۂ تعلیم پنجاب کے ایک اعلان کے سلسلہ میں مولانا نے ۱۸۶۸ء میں لکھی تھی۔ مگر کسی وجہ سے تمام نہ ہو سکی اور بعد کے زمانہ میں اُسے مکمل کرنے کا خیال مولانا نے چھوڑ دیا۔ اس کا یہ ناتمام نسخہ مولانا کے فرزند مخدومی خواجہ سجاد حسین صاحب کے پاس موجود ہے کتاب اُردو میں ہے اور فلسکیپ سائز کے ۲۵۹ صفحات پر نہایت خوشخط لکھی ہوئی ہے۔

۲۔ **رسالہ تذکیر و تانیث**۔ اُردو میں تذکیر و تانیث

کے موضوع پر ایک مبسوط تصنیف لکھنے کا مولانا کا مستقل ارادہ تھا۔ مگر افسوس کہ یہ مفید تصنیف پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی اس کے متفرق مسودات اور یادداشتیں مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی اُن کے کاغذات میں موجود ہیں۔

۳۔ روئیداد جشنِ چہل سالہ حضور نظام ۱۹۰۵ء کے آخر میں مولانا کو سلطنت آصفیہ کی طرف سے اس غرض سے حیدرآباد آنے کی دعوت دی گئی تھی کہ اعلیحضرت نواب میر محبوب علیخاں والیٔ دکن کے جشنِ چہل سالہ کی ایک مفصّل روئیداد مرتّب فرمائیں۔ چنانچہ مولانا حسب الطلب وہاں تشریف لے گئے اور کام شروع ہوگیا۔ ۸ جنوری ۱۹۰۶ء کو اپنے فرزند خواجہ سجّاد حسین صاحب کو جو خط مولانا نے حیدرآباد سے لکھا تھا۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"۔۔۔۔۔۔ مجھے یہاں حضور کے جشنِ چہل سالہ سالگرہ

کی روئیداد لکھنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ جس میں کسی قدر حضور کے خاندان کا حال اور اُن کے عہدِ حکومت کے بڑے بڑے کام بھی درج ہوں گے۔ ابھی اس کے لیے میٹیریل جمع کیا جا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے (حال پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی و سکرٹری انجمن ترقّیِ اُردو) اور ایک کاتب میری مدد کے لیے مجھے ملے ہیں۔ یہاں ملنے والوں کا بہت ہجوم رہتا ہے۔ اس لیے ارادہ ہے کہ چند روز کے لیے ہم سب وقارآباد میں (جو یہاں سے دس بارہ میل ریلوے لائن پر ایک خوش آب و ہوا مقام ہے) جا کر قیام کریں۔ ظاہرا یہ کام چار پانچ مہینے میں ختم ہوگا۔۔۔۔"

مگر مولانا نے اس روئیداد کی تکمیل نہیں کی۔ بعد میں کام دُوسروں کے سپرد ہوگیا اور مولانا واپس وطن چلے آئے۔

و۔ مختلف نثر مضامین

مولانا کے مضامین کی تقسیم حسب ذیل حصص میں کیجا سکتی ہے:

۱۔ فارسی زبان کے بعض وہ مضامین جو مولانا نے وقتاً فوقتاً رسالہ قند پارسی گوالیار اور دیگر رسائل میں لکھے۔ بعض وہ فارسی خطوط جو مولانا نے اپنے ہمعصروں اور دوستوں کو لکھے۔ ان خطوط میں سے کسی پر تاریخ پڑی ہوئی نہیں ہے۔ اس لیے پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ خطوط آپ نے کس کس سنہ میں لکھے۔ بعض مزارات کے کتبے۔ بعض فارسی کتب پر تنقیدیں۔ بعض مختلف اخلاقی مضامین۔ جن میں سے بعض کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

کبر و خود پسندی۔ شجاعت۔ مناصب جلیلہ۔ مدح و ستائش۔ مشق و مہارت۔ مصیبت و ناکامی۔ تعلیم۔ علم اخلاق۔ خودکشی۔ زندگان مردہ۔ دوستی۔ خشم بد تر از دیوانگی است۔

محبت مادری[13] - استہزا[14] وغیرہ

فارسی زبان کی تمام تحریریں مولانا نے ایک جگہ جمع کر کے چھپنے کے لیے دے دی تھیں۔ اور اکتوبر ۱۹۱۴ء میں یہ مجموعہ مطبع سے چھپ کر آگیا تھا۔ مگر اس کی عام اشاعت کی ابھی نوبت نہ آئی تھی کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا کا انتقال ہو گیا۔

۲۔ عربی کے نثر مضامین اور خطوط۔ یہ بھی مولانا نے اپنے فارسی مجموعہ کے ساتھ ہی چھاپے تھے۔ اس میں "جملۃ صالحۃ" کے عنوان سے ایک مضمون سرسید کے متعلق تھا۔ جو مولانا نے "نخلۂ ادبیہ" نامی ایک رسالہ کے لیے لکھا تھا۔ یہ رسالہ لندن سے شائع ہوتا تھا۔ مگر مضمون نہ بھیجنے پائے تھے کہ معلوم ہوا رسالہ بند ہو چکا ہے۔

۳۔ مولانا کے اُردو مضامین۔ جو آپ نے وقتاً فوقتاً رسالہ

تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ۔ رسالہ انجمن مفید عام۔ رسالہ انجمن پنجاب۔ علیگڈھ کالج میگزین۔ معارف علیگڈھ۔ رفیقِ ہند۔

اتحاد لکھنو۔ پیسہ اخبار لاہور۔ رسالہ زمانہ کانپور اور سرمور گزٹ
ناہن وغیرہ میں لکھے۔ ان مضامین کا ایک مجموعہ جولائی ۱۹۰۲ء
میں مولوی سید وحید الدین سلیم (مرحوم) نے "مضامین حالی" کے
نام سے ۲۶۰ صفحات پر شائع کیا تھا۔ مگر یہ نامکمل مجموعہ ہے
اور بہت سے مضمون مولانا کے اس میں نہیں ہیں۔

راقم الحروف نے چودہ پندرہ برس کی محنت اور تلاش کے بعد
مولانا کے اردو مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے۔ جو تین حصوں
پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں مستقل مضامین ہیں۔ دوسرے حصہ
میں مختلف اوقات کی مولانا کی تقریریں ہیں۔ اور تیسرے حصہ
میں وہ تقریظات ہیں۔ جو ملک کی منتخب کتابوں اور ماہوار
رسالوں پر مولانا نے وقتاً فوقتاً لکھیں اور شائع کرائیں۔

ز۔ وہ کتابیں جن کے لکھنے کا مولانا کو خیال تھا

جیسا کہ ہر مصنف اور مولف کا طریقہ ہوتا ہے کہ بہت سی

کتابیں اَور متعدد مضامین اُس کے خیال میں ایسے ہوتے ہیں جن کو مہلت اور فرصت کے اوقات میں مرتّب اور تصنیف کرنے کا اُس کا ارادہ ہوتا ہے۔ یہی حال مولانا کا بھی تھا۔ نہ معلوم کن کن مفید اور کار آمد تصانیف کے خاکے مولانا کے دماغ میں ہونگے۔ جن کی تکمیل مکروہاتِ خانگی۔ عوارض۔ عدیم الفرصتی۔ یا پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ ہو سکی اور وُہ خیال اور ارادہ دل کا دل ہی میں رہا۔ اس قسم کے ارادوں کی جو اطلاعات مجھے مل سکی ہیں اُن کے بموجب حسبِ ذیل کتابوں کے مرتب اَور تصنیف کرنے کا مولانا کو خیال تھا:۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مکمل اور مبسوط سوانحعمری لکھنے کا ارادہ مولانا کا آخر تک رہا۔ لیکن اس مہتم بالشّان کام کے لیے جس فرصت اور اطمینان کی ضرورت تھی۔ افسوس کہ وُہ مولانا کو حاصل نہ ہوسکا۔ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو یقین ہے

کہ آنحضرتؐ کی کثیر التعداد سوانح عمریوں میں ایسی ہی نمایاں ہوتی جیسی اُردو کی تمام موجُودہ سوانح عمریوں میں "حیاتِ جاوید" ہے۔

۲۔ فصیح الملک داغ دہلوی کے کلام کا ایک اعلیٰ درجہ کا انتخاب بھی آپ شائع کرنا چاہتے تھے۔ کچھ کام ہُوا بھی تھا۔ مگر مکروہاتؔ گوناگوں کی وجہ سے بیچ کا بیچ میں رہ گیا اور مکمل نہ ہو سکا۔

۳۔ اصلاحِ معاشرت کے متعلق چند سلیس اور دلچسپ ناول لکھنے کا بھی مولانا کو آخر عمر میں خیال پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ اواخر دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب مولانا کو کچھ دنوں سکون اور آرام کی خاطر فرید آباد (دہلی کے قریب ایک قصبہ ہے) تشریف لے گئے تو آپ نے اس خیال کا اظہار مکرمی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی کے سامنے بھی فرمایا۔ سید صاحب موصوف کا بیان اس کے متعلق مندرجہ ذیل ہے:۔

"ایک اور خیال جس سے مرحوم کے ذوق اور میلان کا

پتہ چلتا ہے۔ اُنہیں یہ پیدا ہوا تھا کہ وُہ اصلاحِ معاشرت کے لیے اُردو میں اس قسم کے ناول لکھیں۔ جیسے کہ بعض نامور مغربی مصنّفوں کی تصنیف ہیں مگر اس کے لیے مرحوم چاہتے تھے کہ پہلے کوئی صاحبِ ذوق شخص (اس قسم کے) منتخب انگریزی ناولوں کا ترجمہ اُنہیں سُنائے اور وُہ اچھّی طرح اُصولِ ناول نویسی کو سمجھ کر کچھ تحریر کریں۔ مخدومی مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے۔ فرید آباد آکر مولوی صاحب مرحوم سے ملے تو اُنہوں نے بھی اس خیال کی تائید کی اور شاید ایک للچ یہ بھی دیا کہ میں خود آپ کو اچھے اچھے ناول سناؤں گا۔ آپ اورنگ آباد (دکن) تشریف لائیں (جہاں اُن دنوں مولوی صاحب موصوف ملازم تھے) چنانچہ مرحوم کا ارادہ ہو گیا تھا کہ ضرور کچھ عرصہ کے واسطے اورنگ آباد چلے جائیں۔ لیکن پانی پت میں پہلے

فارسی کلام چھپوانے کی مصروفیت اور پھر آخری علالت
نے یہ ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔"

ح۔ مولانا کی ایک تصنیف جو ضائع ہو گئی

جب سولہ سترہ برس کی عمر میں ۱۸۵۲ء کے قریب
گھر والوں سے چھپ کر مولانا تحصیلِ علم کی خاطر دہلی گئے اور
وہاں حسین بخش کے مدرسہ میں عربی پڑھنے لگے تو اس دوران
میں نواب صدیق حسن خاں کی تائید میں) جو علیا حضرت
نواب شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے شوہر۔ اچھے عالم و
فاضل اور عقیدے کے لحاظ سے اہلِ حدیث تھے اور کثیر التعداد
کتابوں کے مصنّف ہیں) مولانا نے عربی میں ایک رسالہ تحریر
فرمایا۔ یہ یقیناً مولانا کی سب سے پہلی تصنیف تھی۔ مگر جب
کتاب لکھ کر مولانا نے اپنے اُستاد کے سامنے دکھا لیا اصلاح

کے لیے) پیش کی جو حنفی المذہب تھے۔ تو انہوں نے پڑھ کر کتاب کو پھاڑ ڈالا۔ مولانا کو اپنی سب سے پہلی علمی کوشش کے یوں رائیگاں جانے پر قدرتاً نہایت ملال ہوا مگر استاد کے ادب و احترام کے باعث خاموش ہو گئے۔ اور اس طرح مولانا کی یہ تصنیف ضائع ہو گئی۔ آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب اس کتاب کے متعلق اپنے ایک مضمون مندرجہ "عصرِ جدید" مورخہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء میں لکھتے ہیں:

"غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیرِ تعلیم تھے۔ اُس زمانہ میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خان بہادر کی تائید میں تھا۔ جسے اُن کے اُستاد نے پڑھ کر نہایت ناراضی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ اُس کو چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن اُستاد

نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش کے مدرسہ
میں پڑھاتے تھے کہا کہ "رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت
سے لکھا گیا تھا۔ مگر چونکہ اُس سے ایک وہابی مولوی
کی تائید ہوتی تھی۔ اس لیے چاک کر دیا گیا"۔
یہ ہے مولانا کی نظم و نثر تصانیف کی مجمل اور مختصر
کیفیت۔

مولانا کی جلالت قدر کا اعتراف انکے ہمعصروں کو

یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ دورِ حاضرہ کے ادیبوں، انشا پردازوں اور شعرا میں شمس العلماء مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین صاحب حالی اعلیٰ درجہ کے شاعر اور انشا پرداز ہونے کے علاوہ اخلاق و عادات کے لحاظ سے بھی اپنے ہمعصروں میں ایسے بلند اور نمایاں مقام پر تھے کہ ہر شخص ادب و احترام کے ساتھ اُن کی طرف دیکھتا تھا اور عقیدت کے ساتھ گردن جھکا لیتا تھا۔ مولانا کی اس بزرگی اور برتری کا اعتراف نہ صرف عوام کو تھا۔ بلکہ وُہ لوگ بھی جو اُن کے ہمعصر تھے اور خود بھی بڑی شخصیت اور بڑی شہرت

کے مالک تھے، نہایت کشادہ دلی کے ساتھ بارہا اس حقیقت
کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ دراصل کیرکٹر کی مضبوطی
ہی وہ چیز تھی، جو اس مفید لٹریچر کی تخلیق کا باعث ہوئی جس کو
مولانا کے دماغ نے قلم کے ذریعہ سے دُنیا کے سامنے پیش کیا۔
لہٰذا میں یہاں مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر کچھ مختصر سی بحث
کروں گا تاکہ مولانا کی سوانح حیات کا ایک اہم باب کے کچھ
دُھندلے نقوش سے قارئین کرام رُوشناس ہوسکیں۔ دُھندلے
نقوش میں نے اس لئے کہا کہ میں اس باب کو فی الحال بہت
مختصر طور پر لکھ سکا۔ انشاء اللہ کبھی اس کو مفصّل طور پر بھی
بیان کرسکوں گا۔ اس وقت تو انہی چند سطروں کو غنیمت
سمجھ لیا جائے۔

بچپنے ہی سے نہایت سلیم الطبع تھے۔	"ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ یہ مثل پورے طور پر مولانا پر صادق

پر صادق آتی ہے۔ مولانا بچپنے ہی سے نہایت خاموش سنجیدہ مگر خوش اخلاق تھے۔ باپ نو برس کا چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ والدہ اپنی دائمی بیماری کی وجہ سے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کر سکیں۔ چاہیئے تھا کہ ایسا بچہ جلدی ہی آوارہ ہو جاتا۔ مگر مولانا فطرتی طور سے رُشد اور نیکی لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وُہ زمانہ جو کھیل کُود اور شرارت کا ہوتا ہے وُہ آپ نے نہایت انہماک کے ساتھ قرآنِ مجید پڑھنے اور اُسے حفظ کرنے میں گزارا۔

تحصیلِ علم کا شوق اس مرحلہ سے گزر کر مولانا تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے۔ یہ چسکا ایسا پڑا کہ شادی کے بعد بھی اُس نے پیچھا نہ چھوڑا رشتہ داروں نے کہا "کہیں نوکری کر لو" مگر یہاں تو دُوسرا نشہ چڑھا ہُوا تھا۔ گھر والوں نے مجبور کیا تو چپکے سے گھر سے نکل کھڑے ہُوئے اور دو برس تک نہایت خاموشی کے ساتھ دہلی میں تحصیلِ علم کرتے رہے۔ گھر والوں کو پتہ لگا تو جا کر لے آئے۔

اس سے اس ذوق اور شوق کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ تحصیلِ علم کا آپ کے دل میں موجزن تھا اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے ایک دن آپ کو "شمس العلماء" بنایا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے تباہ کن سانحہ کا اثر مولانا کی طبیعت پر

مولانا جب دہلی میں تحصیلِ علم میں مشغول تھے۔ اُس کے پانچ برس کے بعد غدر ہوگیا اور مسلمانوں پر جو کچھ گزرنا تھا وہ گزر گیا۔ مسلمانوں کی عام تباہی اور اُن کی بربادی کا ایسا گہرا اثر مولانا پر پڑا کہ مولانا کا دل یکسر درد اور رِقّت سے بھر گیا اور یہی رقّت اور درد اُس لاجواب اور بے نظیر نظم کا باعث ہُوا، جو "مدّ و جزرِ اسلام" کے نام سے آگے چل کر مولانا نے دنیا کے سامنے پیش کی اور جو مسدس حالی کے نام سے آج سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ اسی نظم پر کیا موقوف ہے۔ مولینا نے ساری زندگی مسلمانوں کا دکھڑا رونے اور اُنکے زوال کا ماتم کرنے میں گزار دی چنانچہ ایک خط میں خود

مولوی ظفر علی خاں بی۔اے مدیر زمیندار لاہور کو جو اُن دنوں "دکن
ریویو" کے ایڈیٹر تھے لکھتے ہیں۔ " مجھے تو مسلمانوں کے دُکھڑے نے
اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کچھ بھی طبع آزمائی کرتا۔
مولوی اسماعیل صاحب میرٹھ والے بھی اب ہماری طرح پا در رکاب
ہیں۔ صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی صورتیں نظر
آتی ہیں بشرطیکہ آپ کو فکرِ معاش دم لینے دے اور یہ چینک
بھی دل کو لگی رہے۔" (خط مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ء)

کسی کی ذراسی تکلیف سے بیحد متاثر ہوتے

دلّی مولانا کے سامنے آباد تھی اور اُنہی کے
سامنے اُجڑی۔ اُس کے سارے صاحب
کمال ایک ایک کر کے مولانا کے سامنے رخصت ہوئے۔ یہ دردانگیز
نظارہ ایسا نہ تھا جو سخت سے سخت دل کو بھی پگھلا کر موم نہ کر دیتا۔
اور پھر مولانا جیسے حسّاس دماغ رکھنے والے بزرگ پر تو اس کا
بے انتہا اثر پڑا، اور ایسا پڑا کہ مرتے دم تک نہ گیا۔ خلقی نیکی اور

فطرتی اخلاق کے علاوہ یہ دردانگیز نظّارے بھی مولانا کو ایک پیکرِ اخلاق و ہمدردی بنانے میں بہت کچھ ممد و معاون ہوئے اور انہی کا اثر تھا کہ مولانا لوگوں کی ذراسی تکلیف سے بے حد متاثّر ہوتے اور جہاں کسی کو مصیبت میں دیکھتے بے چین ہو جاتے اور اپنے سے جہاں تک بنتا اُس کی تکلیف رفع کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑتے۔

مولانا کی ہمدردی کا ایک عجیب واقعہ

مولانا کی یہ ہمدردی کچھ مسلمانوں ہی سے مخصوص نہ تھی، بلکہ وُہ اپنے ہموطن ہندوؤں کے دُکھ درد کے بھی ایسے ہی شریک تھے، جیسے مسلمانوں کے۔ بلالحاظ مذہب و ملّت مولانا کی عامہ خلائق سے ہمدردی کی مندرجہ ذیل مثال آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ایک مرتبہ بھنگی کا ایک چھوٹا لڑکا موری میں جا پڑا اور کیچڑ میں لت پت ہو کر چیخ رہا تھا۔ پاس ہی لوگ کھڑے ہوئے اُسے دیکھ رہے تھے۔ مگر

اِس گندی حالت میں کوئی اُسے اُٹھاتا نہیں تھا اور گندی حالت میں نہ بھی ہوتا، تو بھی بھنگی کے لڑکے کو کون ہاتھ لگانے کا روادار تھا۔ مولانا کا اتفاقاً اُدھر سے گزر ہُوا تو آپ نے اُسے دیکھتے ہی اپنا تانگہ ٹھیرالیا۔ اُس کے پاس گئے، محبّت سے اُسے اُٹھایا، بہت پیار سے اُس کے کپڑے اُتارے اور اُس سے پتہ پُوچھ کر اُس کے ماں باپ کے پاس اُسے چھوڑ کر آئے۔

ضرورتمند اصحاب کی ہر ممکن مدد کرتے

اسی عادت کا اثر تھا کہ جو شخص اپنی ضرورت یا حاجت لے کر مولانا کے پاس آتا، مولانا حتی الامکان اُس کی ضرورت رفع کرنے میں کوشش فرماتے اور جہاں تک بنتا ضرور ہی اُس کا کام کر دیتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ مَیں نواب صاحب کنجپورہ کے ہاں ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ایک سفارشی چٹھی مجھے لکھ دیں اور اُس میں یہ تحریر فرمادیں کہ حامل رقعہ میرا رشتہ دار اور

عزیز ہے۔ اس سے یقین ہے کہ مجھے نوکری مل جائے گی۔
آپ نے بلا تامل خط لکھ دیا کہ" یہ صاحب میرے رشتہ دار اور
عزیز ہیں اور جو سلوک آپ ان کے ساتھ کریں گے وُہ میرے
ساتھ ہوگا۔" جب وُہ شخص رقعہ لے کر چلا گیا تو پاس بیٹھے ہوئے
ایک صاحب جو مولانا کے خاندان سے واقف تھے کہنے لگے
"مولوی صاحب! یہ آپ کا رشتہ دار تو نہیں تھا۔ پھر آپ نے
ایسا کیوں لکھ دیا؟" آپ نے فرمایا" میاں تم نے سُنا نہیں
کہ ع بنی آدم اعضائے یکدیگرند۔ اگر اتنا بھی ہم اپنے بھائیوں
کے کام نہ آسکیں تو ہماری حالت پر افسوس ہے۔ ذرا سوچو تو
سہی اگر صرف اتنا لکھ دینے سے اس شخص کو نوکری مل جائے
تو اس میں میرا کیا ہرج اور نقصان ہے۔"

مذہبی تعصب سے کوسوں دُور تھے

تعصب مذہبی جس کے متعلق خود کہتے ہیں کہ
ع "بھرے گھر کئے سینکڑوں اس نے ویراں"

آپ میں نام کو بھی نہ تھا۔ جیسے مسلمان آپ کو اخلاص کی نظر سے دیکھتے تھے، ویسے ہی ہندو آپ سے عقیدت رکھتے تھے۔ کبھی کسی ہندو کو آپ سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہیں ہوئی اور اب تک بھی ہر ہندو کے دل میں آپ کا ادب اور احترام موجود ہے۔

ہندوؤں کے دلوں میں آپ کا ادب و احترام	جب آپ کی وفات ہوئی، تو جہاں مسلمان شعرائے نے آپ کے مرثیے لکھے، وہاں

لالہ تلوک چند محروم وغیرہ نے بھی نظم کے ذریعے آنسو بہائے۔
لالہ سری رام ایم۔اے نے اپنے مشہور عالم تذکرہ "خمخانہ جاوید" میں بڑے ادب اور احترام اور عقیدت و جوش کے ساتھ آپ کا تذکرہ کیا ہے۔ ذرا آخری فقرہ ملاحظہ ہو: "کئی سال سے زیادہ تر وطن میں قیام پذیر رہتے ہیں۔ گو دہلی بھی اکثر آتے رہتے ہیں راقم تذکرہ کو بچپن سے آپ کی خدمت سراپا برکت میں نیاز

حاصل ہے۔ ازبس خلوص نوازش کا اظہار فرماتے رہتے ہیں"
(جلد دوم صفحہ ۳۵۸ مطبوعہ سنہ ۱۹۱۱ء)

مولانا کا برتاؤ اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ

جتنی اُلفت اور جس قدر محبت مولانا کو اپنے ہندو دوستوں سے تھی۔ آپ یقین کیجئے کہ اتنی یگانگت آج کل دو مسلمان یا دو ہندو دوستوں میں بھی ہرگز نہیں ملیگی۔ اپنے نہایت ہی عزیز دوست لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی کی وفات پر جو تعزیتی خط مولانا نے آنجہانی کے لڑکے لالہ چندو لال صاحب کو لکھا ہے۔ اُس سے اُس تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو آپ کو اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ تھا۔ ذرا سُنیئے :-

عزیزی و شفیقی سلمہ اللہ

آپ کی تحریر سے میرے نہایت دلی دوست لالہ بہاری لال مشتاق مرحوم کی وفات کا حال معلوم ہوا۔ جس کا صدمہ کبھی

دل سے فراموش نہیں ہو سکتا۔ میرے دہلوی دوستوں میں سے افسوس ہے کہ ایک خالص اور مخلص دوست کم ہو گیا جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔ ایسے وضعدار، محبت کے پتلے حاضر و غائب یکساں اور اپنے سکول کے فدائی بہت کم ہوتے ہیں خدا تعالیٰ اپنی رحمت سے اُن کو بخشے اور اُن کے عزیزوں اور پسماندوں اور دوستوں کو صبر عنایت کرے۔۔۔ زیادہ دعا

الطاف حسین حالی از پانی پت یکم اکتوبر ۱۹۰۸ء

رائے بہادر ماسٹر پیارے لال انسپکٹر مدارس پنجاب اور لالہ مدن گوپال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا دہلی سے مولانا کے نہایت گہرے تعلقات تھے اور آپ اُن کو اپنے بھائیوں کے برابر عزیز سمجھتے تھے۔ لالہ مدن گوپال، لالہ سری رام ایم اے مصنف "خمخانۂ جاوید" کے والد تھے۔ اُن کے متعلق اُستاذی المحترم جناب مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب نے ایک بڑا مزے کا لطیفہ

سنایا۔ دہلی میں لفٹنٹ گورنر آنے والے تھے۔ تجویز یہ ہوئی
کہ اُن کی خدمت میں باشندگانِ شہر کی طرف سے ایک
ایڈریس پیش کیا جائے۔ لالہ مدن گوپال بیرسٹرایٹ لا نے
مولینا سے کہا کہ" آپ ایڈریس کا مسودہ اُردو میں لکھ دیں۔
میں اُس کا انگریزی میں ترجمہ کرلوں گا اور پھر اُسے چھپوا لیا
جائیگا۔ مولینا نے ازراہِ انکسار فرمایا" بھلا میں آپ کے سامنے
کیا ایڈریس لکھوں گا۔ اس قسم کی چیزوں کے لکھنے کا کبھی
اِتفاق نہیں ہوا۔ پھر یہ بھی بات ہے کہ یہ بہت طول امل
ہے کہ مَیں اُردو میں لکھوں اور پھر آپ اُس کی انگریزی
بنائیں، پس براہِ راست انگریزی ہی میں لکھ لیجیے" اس پر
لالہ مدن گوپال کہنے لگے" مولینا اس وکالت کے پیشے
نے دماغ کی کچھ ایسی حالت بنادی ہے کہ جس کام میں نقد
مالی فائدہ نظر نہ آئے اُس پر محنت کرنے کو دل کسی طرح آمادہ

ہی نہیں ہوتا۔ پس یہی بہتر ہے کہ آپ اُردو میں لکھ دیں اور بندہ جھٹ پٹ آنکھیں بند کر کے اُس کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالیگا۔" مولینا ہنسنے لگے اور آپ نے اُردو میں ایڈریس لکھ دیا۔

ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے

ہندو معززین سے ذاتی تعلقات کے علاوہ ہندو مسلمانوں کے عام اتحاد کے بھی آپ زبردست حامی تھے اور اس نفرت و حقارت کو جو دونوں قوموں کے درمیان پھیل رہی ہے نہایت بُرا سمجھتے اور ملکی ترقی کی راہ میں ایک سنگِ گراں جانتے تھے۔ چنانچہ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کے پندرہ روزہ رسالہ اتحاد میں جو مضمون آپ نے ہندو مسلمانوں کے اتفاق پر لکھا تھا۔ اس کے مطالعہ سے ہمارے اس دعویٰ کی پُوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اس مضمون میں ایک مقام پر مولینا فرماتے ہیں :-

"درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہوسکتا۔ کہ ہندو مسلمانوں میں دوستی اور یک جہتی کے روابط مستحکم نہیں ہوسکتے۔ بے شک بدقسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہوگئے ہیں۔ جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس امر کے باور کرنے کی وجوہات موجود ہیں کہ جس قدر ملک میں تعلیم کی ترقی ہوتی جائیگی۔ جس قدر لوگ قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اور جس قدر نااتفاقی کے مضر نتائج لوگوں پر آشکارا ہوتے جائیں گے۔ اُسی قدر اُن پر یہ راز ظاہر ہوتا جائیگا کہ بغیر اتّفاق و یکجہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں عزّت سے رہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں عزّت وتوقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔ یہی تعلیم جس نے بالفعل دونوں فرقوں میں زہر گھول رکھا ہے، یہی زہر آگے

چل کر ایک دن تریاق کا کام کرنے والا ہے۔"

(اتحاد لکھنؤ جلد ۱ نمبر ۶ مورخہ ۱۶ جون ۱۹۰۴ء)

نہایت خاموشی کے ساتھ لوگوں کی حاجت روائی کرتے	جو حاجتمند مولینا کے پاس آتا خواہ ہندو ہوتا یا مسلمان، جہاں تک اُن سے

ہوسکتا ضرور اُس کی حاجت پوری کر دیتے۔ مولینا کے ملازم تانو خاں نے سُنایا کہ دہلی میں اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی حاجت مند آتا اور اپنی ضرورت بیان کرتا تو جو کچھ مولینا کے پاس ہوتا اُس کی امداد سے دریغ نہ کرتے اور خفیہ طریقہ سے مُٹھی بند کر کے جو مناسب سمجھتے، اُسے دے کر رخصت کر دیتے۔ کبھی کسی نے نہ جانا کہ مولینا نے فلاں حاجتمند کو کیا دیا؟

انتہائی طور پر رقیق القلب اور مخلوق کے حقیقی ہمدرد تھے	مولینا کے مزاج میں رقّتِ قلب بہت تھی۔ ذرا بھی کسی کو تکلیف یا بیماری

یا مصیبت میں دیکھتے تو آپ کے دل پر اس کا بیحد گہرا اثر ہوتا اور

جب تک اُس غریب کی وُہ تکلیف رفع نہ ہو جاتی، مولینا کو چین نہ آتا تھا۔ مصیبت زدہ اگر نادار اور غریب ہوتا، تو مولینا کی ہمدردی اُس سے دہ چند بڑھ جاتی تھی۔

ادنیٰ درجہ کے لوگوں سے اعلیٰ درجہ کی ہمدردی کی ایک حیرت انگیز مثال

۱۹۱۲ء میں تبدیل آب و ہوا اور کچھ سکون و آرام کی خاطر مولینا اپنے ایک عزیز ہم وطن ڈاکٹر لیاقت حسین صاحب ہاسپٹل اسسٹنٹ کے پاس کچھ عرصے کے لیے فرید آباد چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس مکان میں مولینا کو ٹھیرایا اُسی کے احاطے میں ایک عورت وزیرن مع اپنے بال بچّوں کے رہتی تھی۔ وزیرن کی طلاقتِ لسانی اور جنگجویانہ عادت کی محلّہ بھر میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ذرا کسی سے ہو پڑنے کی دیر تھی۔ پھر محلّہ بھر میں وُہ قیامت برپا ہوتی تھی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ میدانِ جنگ میں فتح پاکر اپنے

مستقر پر آنے کے بعد بھی دیر تک اُس کی گرج اور
شعلہ فشانی کم نہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی جب اتفاق سے کوئی غیر لڑنے
کو نہ ہوتا، تو خود اپنے بچّوں ہی پر اُس کے غیض و غضب کی
آگ بھڑک اُٹھا کرتی تھی اور اُس وقت خود اِس شیرنی کے
بھٹ ہی میں قیامت کا شور و ہنگامہ بپا ہو جایا کرتا تھا۔
مولینا کے آنے کی اطلاع آئی، تو سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کو
اِس ہتھنی کا خیال آیا کہ یہ اپنی عادت کے موافق شور و غوغا
مچائیگی اور مولینا کی طبیعت منغص ہوگی۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب
نے اُسے بُلایا اور کہنے لگے "سُن وزیرن! ہمارے ایک
بزرگ دو تین دن میں یہاں آنیوالے ہیں اور کچھ دنوں اِس
مکان میں رہیں گے۔ اگر تو اُن کے سامنے بھی اپنی روزمرّہ
کی کرتوتوں سے باز نہ آئی تو پھر مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ اگر
مَیں نے ایک دن بھی تیری گالیوں اور کوسنوں کی آواز

مولوی صاحب کے قیام کے زمانے میں سُن لی۔ تو پھر خوب اچھی طرح سمجھ لے کہ فوراً چٹیا پکڑ کے اس مکان سے نکال دُونگا اُن کے جائے پیچھے جتنا تیرا دل چاہے اس وقت کی کسر نکال لیجئو۔ لیکن اُن کے ہوتے بالکل چُپ چاپ رہیو"۔ انسانیت سے کام لیا کہ کچھ ڈاکٹر صاحب کے خوف اور کچھ مولٰینا کے لحاظ سے شکایت کا موقع نہ آنے دیا۔ ایک روز کچھ رات گئے اُس کا چھوٹا بچّہ کچھ بیمار ہو گیا اور ساری رات روتا رہا۔ جب بچّہ کے رونے کی آواز مولٰینا نے سُنی، تو اُن کی طبیعت بےچین ہو گئی۔ کچھ دیر تو مولٰنا خاموش رہے۔ مگر پھر آپ سے ضبط نہ ہو سکا اور آپ اپنے بستر سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ چل کر چبوترے کے کنارے تک آئے اور وزیرن کو آواز دی۔ بچّے کا حال دریافت کیا اور فرمانے لگے کہ اگر اس وقت ڈاکٹر کی یا دوائی کی ضرورت ہو، تو کچھ انتظام کیا جائے"۔ وزیرن

نے کہا "نہیں مولوی صاحب اب صبح کو دیکھی جائیگی معمولی بخار ہے۔" غرض مولینا وزیرن کو تسلّی و تشفی دے کر چلے آئے۔ مگر ساری رات آپ کا خیال غریب عورت کے چھوٹے بچّے ہی میں پڑا رہا۔ صبح ہوتے ہی جب ڈاکٹر لیاقت حسین صاحب حسب معمول مزاج پُرسی کو آئے، تو مولینا نے دروازے ہی سے اُن کا سلام لے کر فرمایا کہ "آپ پہلے ذرا وزیرن کے بچّے کو دیکھ آئیے، وُہ بیچارہ بخار سے رات بھر رویا ہے۔" ڈاکٹر لیاقت حسین صاحب مرحوم طبابت پیشہ ہونے کے باوجود اِس قدر صفائی پسند واقع ہوئے تھے کہ اُنھیں غربا کے گندے اور غلیظ مکانوں میں فیس لے کر جانے سے بھی تامّل ہوتا تھا۔ لیکن مولانا کے حکم کی تعمیل چونکہ ضروری تھی۔ لہٰذا مجبوراً گئے اور جب تک بچہ اچھا نہ ہولیا، برابر اُس کی دوا دارو کرتے اور اُس کے ہاں جاتے رہے۔ مولینا کی ہمدردی کا یہ حال تھا کہ روزمرّہ ڈاکٹر

صاحب سے بچہ کی حالت اور کیفیت پوچھ لیا کرتے تھے اور توجہ کے ساتھ علاج کی تاکید کرتے رہتے تھے۔

ہر شخص آپ کی صحبت میں بہت جلد بے تکلف ہو جاتا

مولینا کا طرز گفتگو اور اندازِ تخاطب اس قسم کا تھا کہ ہر ایک شخص مولینا کی صحبت میں بہت جلد بے تکلف ہو جایا کرتا تھا۔ مولینا کی یہ عادت ایک مرتبہ ایک بڑے دلچسپ لطیفہ کا موجب ہوئی۔ ذرا سنیئے۔

ایک نہایت مزیدار لطیفہ

جس زمانہ میں مولینا فرید آباد میں قیام پذیر تھے۔ تو ایک روز مولینا کا ناواقف نوکر خط بنانے کیلئے ایک ایسے نائی کو لے آیا جو اگرچہ خاندانی حجّام تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی نہایت نشہ باز اور آوارہ مزاج بھی واقع ہوا تھا خیر نائی صاحب نے خط بنانا شروع کیا اور اسی دوران میں آپ فرمانے لگے "اجی حضور مولوی صاحب! خدا آپ کو خوش رکھے ایک کام تو ہمارا ابھی کر دیجیئے۔ ساری عمر آپ کی جان و مال کو

دُعا دیتا رہوں گا۔" اور یہ کام بتایا کہ "ہمارا ایک عورت پر دِل آگیا ہے۔ ہم نے اُس سے شادی کرنی چاہی، وُہ تو راضی ہوگئی تھی، مگر خدا ستیاناس کرے اُس کے رشتہ داروں کا کہ اُنھوں نے خدا واسطے کے بیر میں آکر اُسے بہکا دیا اور نہ معلوم میری طرف سے اُس کے کان میں کیا پھونکا کہ اب وُہ عورت بھی فرنٹ ہوگئی ہے۔ مَیں نے ہر چند کوشش کی، مگر وُہ کمبخت کسی طرح پگھلنے ہی میں نہیں آتی۔ پس حضور کوئی ایسا تعویذ مجھے لکھ دیں کہ اُس کے بھائی بند اور وُہ خود ہاتھ جوڑتے اور خوشامد کرتے پھریں اور مولوی صاحب یہ کام تو ہمارا آپ کو کرنا ہی ہوگا۔ چاہے خط کے پیسے آپ نہ دیں مگر تعویذ ضرور لکھ دیں۔ مَیں نے آپ کی بڑی تعریف سُنی ہے، اور مَیں بغیر تعویذ لیئے یہاں سے ہرگز نہ ٹلوں گا۔"

مولٰینا کے پاس حاجتمند تو بہت سے آئے تھے، مگر آجتک

ایسے عجیب و غریب سائل سے اُنہیں واسطہ نہ پڑا تھا۔ ہنسی تو
بہت آئی مگر مولینا نے ضبط کیا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ
اُس سے پوچھا کہ "میاں اُس نیکبخت کا نام کیا ہے۔ کس محلّہ میں
رہتی ہے۔ اُس کے ماں باپ بھائی وغیرہ کون ہیں"؟ اور سب
کچھ پوچھ کر کہا "میاں اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ گھبرانے
کی بات نہیں۔ اب تم جاؤ۔ ہم تمہارے لیے ضرور کوئی تدبیر
کریں گے، اور اگر ہو سکا تو ضرور تمہاری شادی اُس سے کرا دینگے"
لطف یہ ہے کہ یہ وعدہ مولینا نے حجّام سے محض مذاقاً نہیں
کیا تھا۔ بلکہ جب دُوسرے دن قصبہ کے ذی وجاہت اصحاب
مولینا کے پاس جمع ہُوئے، تو مولینا نے نہایت شدّومد کے
ساتھ چھٹّو حجّام کی سفارش کی اور کہا کہ "جس طرح بھی ممکن ہو
آپ صاحبان کوشش کریں کہ اُس عورت کے والدین اُس سے
اس کی شادی کر دیں"۔ لوگوں نے مولینا کو بتایا کہ "حضرت!

چھٹو کے ساتھ رشتہ کرنا غریب لڑکی کو تباہ اور برباد کر دینا ہے
کیونکہ وہ نہایت آوارہ، نشہ باز، جواری اور عیّاش آدمی ہے
اگر ایسا ہو گیا، تو بیچاری عورت کی زندگی اجیرن ہو جائے گی"۔
جب مولٰینا کو یہ حالات معلوم ہوئے تب کہیں جا کر مولانا اُسکی
وکالت سے دست بردار ہوئے۔

کسی کو مصیبت میں دیکھتے
تو بے چین ہو جاتے

یہ واقعہ تو خیر ایک مزیدار لطیفہ بن گیا۔
مگر حقیقت یہ ہے کہ مولٰینا اس قدر
نرم دل اور رقیق القلب واقع ہوئے تھے کہ ذرا بھی کسی اپنے
پرائے کی تکلیف یا مصیبت کا حال سُنتے، تو معاً سخت بیچین
اور مضطرب ہو جاتے۔ مولٰینا کے قیام فرید آباد کے زمانہ میں
جنگ بلقان شروع ہو گئی، جس کی خبریں بے انتہا بے چینی اور
اضطراب کے ساتھ ہندوستان کے مسلمان پڑھتے تھے فرید آباد
میں بھی زمیندار کی خبروں اور الہلال کے مضامین کا نہایت

چرچا ہو رہا تھا۔ مولینا بھی روزمرّہ آنے جانے والوں سے لڑائی کی خبریں بڑے توجّہ اور غور سے سُنتے اور ترکوں کی مصیبتوں اور نقصانات کا حال پڑھ کر نہایت درجہ بے تاب ہو جاتے۔ مکرمی سیّد ہاشمی صاحب فریدآبادی جو اس وقت وطن میں مَوجُود تھے بیان کرتے ہیں کہ بارہا صبر و سکون کا پیمانہ چھلک گیا اور اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے کئی دفعہ زبان سے اس مظلومانہ آرزو کا بھی اظہار ہوا کہ الٰہی وُہ وقت بھی کبھی آئیگا۔ جب کہ ترک و ایرانیوں کے قتل و خون کی بجائے ہم یہ سنیں گے کہ آج اتنے جرمن مارے گئے اور آج اتنے روسی کام آئے؟ پانی پت کے ایک صاحب کہتے تھے کہ جب مولوی صاحب مرحوم کو انتقال سے چند ہفتے پہلے یورپ میں جنگ چھڑنے کی خبر سُنائی گئی، تو اُنھوں نے بستر پہ اُٹھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔

مولٰینا احسن اللہ خاں صاحب ثاقب ایک مضمون کے دَوران
میں لکھتے ہیں کہ "راقم ۱۹۰۸ء میں بمقام پانی پت اُن کا مہمان
تھا۔ برسات کا زمانہ تھا۔ دو تین روز مینہ بہت زور شور سے
برسا اَور غربا کے مکانات گرنے لگے۔ مولٰینا کا معمول تھا کہ
روزانہ میرے پاس ۸ بجے صبح سے ۱۲ بجے تک اور عصر سے
عشا تک تشریف رکھتے تھے۔ اس بارش کے ہنگامے
میں مَیں نے دیکھا کہ وُہ متواتر دو تین روز جب تک سخت
بارش ہوئی۔ صبح کے وقت میرے کمرے میں مضطربانہ برابر
ٹہلتے اَور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر نہایت خضوع و خشوع سے جناب
باری میں غربا کے لیے جن کے مکان گر رہے تھے دُعا کرتے
رہے۔ پھر بارش موقوف ہو گئی۔"

(رسالہ ادیب اُردو لکھنؤ۔ بابت یکم فروری ۱۹۲۱ء صفحہ ۶)

بدزبان اور بدکلام نہیں تھے | ایک بڑی خوبی مولانا میں یہ تھی کہ

آپ کو چاہے کتنا ہی غصہ آتا، کبھی اپنی زبان کو بدزبانی اور بدکلامی اور دشنام دہی سے آلودہ نہ کرتے اور یہ مولینا کی ایسی خصوصیت ہے کہ جس شخص کا بھی مولنا سے واسطہ پڑا ہے، یا جسے آپ کے پاس چند روز یا زیادہ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہ سب بالاتفاق مولانا کی اس عادت کی تعریف کرتے ہیں۔ خاکسار راقم نے مولینا کے متعدد ملازمین سے بہت کرید کرید کر پوچھا لیکن ہر شخص نے صاف طور پر یہی کہا کہ ہم نے مولینا کو کبھی گالی دیتے یا کسی کو برا بھلا کہتے نہیں سنا۔ انتہا یہ ہے کہ ملازمین کبھی خود غصہ میں بڑبڑانے لگتے تو آپ سن کر طرح دے جاتے۔ استاذی المکرم جناب مولوی غلام الحسنین صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا نے اپنے ملازم عطاء اللہ سے کسی چیز کے متعلق دریافت کیا تو اس نے ترشروئی سے جواب دیا "یہ کیا رکھی ہے؟ آپ نے اس پر

جناب مولوی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر صرف اتنا فرمایا۔
"دیکھا تم نے عطاء اللہ کو؟ یہ کہہ کر یہ گویا مجھے اندھا بنا رہا ہے کہ یہ چیز تو رکھی ہے مگر تمہیں نظر نہیں آتی"۔ مگر ملازم کو پھر بھی کچھ نہ کہا اور خاموش ہو گئے۔

مامی سے جو ایک غریب عورت تھی اور جسے مولٰینا نے اپنے مکان کا ایک علیحدہ حصّہ رہنے کے لیے دے رکھا تھا۔ جب خاکسار راقم تذکرہ نے اس امر کے متعلق دریافت کیا، تو وہ کہنے لگی کہ میں نے ساری عمر میں کبھی کوئی گالی یا بُرا کلمہ مولوی صاحب کی زبان سے نہیں سُنا"۔ عطاء اللہ ملازم کی بھی یہی شہادت ہے۔ نانو خاں تو اُن کو یاد کر کر کے رویا کرتا تھا۔ ذکر کرتا تھا اور ٹھنڈا سانس بھرتا تھا۔

مکرّمی سیّد ہاشمی صاحب جو قیام فرید آباد کے زمانہ میں مولٰینا کی خدمت میں حاضر رہے ہیں، اپنے ایک مضمون میں

لکھتے ہیں۔ "مولینا کے مشاغل، خیالات اور گفتگو بالکل
پاک صاف اور نہایت مُہذّب ہوتی تھی اور کبھی کوئی رکیک
بات یا کلمہ ہزل اُن کی زبان پر نہ آتا تھا۔" دشنام یا گالی
دینا تو بڑی بات ہے۔ مولانا کو اپنے نفس اور طبیعت پر اتنا
زبردست قابو حاصل تھا کہ کبھی سخت سے سخت موقع
پیش آنے پر بھی کبھی کسی پر ناراض نہیں ہوتے تھے۔
قاعدہ ہے کہ کمزور پر سب سے زیادہ غصّہ آیا کرتا ہے۔
اور سب سے زیادہ کمزور طبقہ ملازمین اور نوکروں کا خیال کیا
جاتا ہے۔ کیونکہ وُہ بیچارے تنخواہ پاتے اور اس وجہ سے
مالک کی ہر جا و بیجا بات کو سہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن
مولینا کے سارے ملازمین اور مولینا کے رشتہ داروں کا
یہی بیان ہے کہ مولینا کبھی کسی پر ناراض اور غصّہ نہیں ہوتے
تھے۔ مامی نے خود راقم تذکرہ ہذا سے بیان کیا کہ عطاءاللہ

اکثر مولوی صاحب پر ناراض ہوتا اور دیر تک بڑ بڑاتا رہتا
مگر مولوی صاحب سُن کر چُپ ہو جاتے اور کچھ نہ کہتے میں
یہ دیکھ کر کہتی، مولوی صاحب آج عطاءاللہ کو غصہ چڑھ
رہا ہے۔ فرماتے "ہاں بھئی! کبھی ہم اس پر ناراض ہو لیتے
ہیں۔ کبھی یہ ہم پر ناراض ہو لیتا ہے۔ آج اس کی باری ہے
اچھا ناراض ہو لینے دو"۔

نہایت شیریں کلام اور خوش اخلاق تھے

ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے نہایت خندہ روئی
اور شیریں کلامی سے پیش آتے تھے۔
جو آدمی ایک مرتبہ اُن کی صحبت اُٹھا لیتا تھا ہمیشہ کیلئے
اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا، چنانچہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ
بی۔اے وکیل اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "۱۹۰۹ء
کا وہ مبارک زمانہ ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہیگا
جبکہ مولٰینا دوبارہ کامل پانچ برس کے بعد پھر میرٹھ

تشریف فرما ہوئے (پہلی مرتبہ ۱۹۰۴ء میں تشریف لے گئے تھے۔ اسماعیل) اور مجھ پر یہ راز منکشف ہوا کہ مولٰینا نہ صرف نظم و نثر کے میدان میں گوئے سبقت لے گئے ہیں، بلکہ حُسنِ اخلاق کی بھی دشوار گزار منزلیں طے کر چکے ہیں، وُہ صفات جو ایک انسان میں ہونی چاہئیں اور جن کی وجہ سے انسان حیوان سے ممیز ہے، تقریبًا سب مولٰینا میں پائی جاتی ہیں۔ محبت و شفقت، ہمدردی، خُداترسی، سلیقہ مندی، انصاف پسندی اور شریفانہ برتاؤ کی مثالیں اُن کی روزانہ زندگی میں بکثرت ملتی ہیں۔ وُہ نہ صرف اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی سے محبت و ہمدردی سے پیش آتے ہیں بلکہ غیروں سے بھی اُن کا یہی سلوک ہے۔ مَیں کئی بار اُن کی خدمت میں مشرّف ہو چکا ہوں اور ہمیشہ مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا اشتیاق رہتا ہے۔ بلا شُبہ مجھے اور بزرگوں

سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن جو خاص اثر مولانا کی کی صحبت میں رہنے سے دل پر ہوتا ہے، اُس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی"۔ (رسالہ زمانہ بابت ماہ جولائی ۱۹۱۳ء صفحہ ۲۵ و ۲۶)

آگے چل کر صفحہ ۲۹ پر لکھتے ہیں:- "مولانا کے شریفانہ برتاؤ کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ سب سے حُسنِ اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ کوئی اجنبی مولانا کی خدمت میں مشرف ہو اور بندہ بے دام نہ ہو جائے۔ ایسے بے نفس آدمی واقعی دُنیا میں کم ہیں"۔

آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب نے مولانا کی وفات پر جو مضمون اُن کے متعلق اپنے اخبار عصرِ جدید میرٹھ میں لکھا تھا اس میں تحریر فرماتے ہیں۔ "اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروّت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا"۔

(عصرِ جدید ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء)

مولینا کی پاکیزگیٔ اخلاق کا اثر پاس بیٹھنے والوں پر

مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی لکھتے ہیں "مولینا حالی مرحوم کی زندگی شرافت و صداقت، حلم و انکسار، اور صبر و سادگی کا قابل دید نمونہ تھی۔ اُن کے اخلاق شائستہ کا پرتو پاس بیٹھنے والوں پر بھی پڑتا تھا۔ بزرگوں نے لکھا ہے اور مَیں نے اُن کی صحبت میں آزمایا کہ نیکوں کے محض حضور میں بُرے سے بُرے دل بھی صلاح و نکوئی قبول کرتے ہیں"۔

لوگوں کی غیبت اور بُرائی کبھی نہ کرتے

غیبت ایک ایسا عالمگیر مرض ہے کہ اس نامراد بیماری میں ہر شخص خواہ چھوٹا ہو یا بڑا بُری طرح مبتلا ہے۔ بقولِ مولینا ؎

سب اس میں گرفتار چھوٹے بڑے ہیں سمجھ پر ہماری یہ پتھر پڑے ہیں

ہر محفل اور ہر مجلس میں جہاں چار آدمی جمع ہوں، سوائے لوگوں کی غیبت کے اور کوئی ذکر وہاں آپ نہ سنیں گے غیبت ہی ایسی

مرغوب غذا ہے کہ کوئی جلسہ اس سے خالی نہیں اور جہاں یہ غذا بہ افراط موجود نہ ہو، وہ محفل ہی سونی، بدمزہ اور پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ لوگ اپنے بھائیوں کا خون جس رغبت کے ساتھ کھاتے ہیں، الذیذ سے لذیذ غذا ایسے شوق کے ساتھ نہیں کھاتے زمانے کی جو حالت آج کل ہے۔ اُس کا نقشہ خود مولینا ایک رُباعی میں اس طرح کھینچتے ہیں ؎

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی بُرائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمّت میں

غیبت کی اس کثرت اور بہتنات کے باوجود جبکہ ع
آلودہ اس خون میں ہر بشر ہے۔ مولینا کا دامنِ زندگی اس خون کے ناپاک دھبّوں سے یکسر پاک نظر آتا ہے۔ بہت سی

شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ مدت العمر کبھی مولٰینا نے اپنی زبان کو لوگوں کی غیبت اور بُرائی سے آلودہ نہیں کیا۔ کسی کا عیب سُنتے یا تو خاموش ہو جاتے یا پھر اُس عیب کی ایسی نرم تاویل کر دیتے کہ وُہ عیب معلوم نہ ہوتا۔ ہر ایک سے حُسنِ ظن رکھنے اور کسی کے متعلق بُرا خیال نہ کرتے۔ کبھی کسی شخص نے نہیں سُنا کہ اُنھوں نے کسی کی بُرائی لوگوں کے سامنے بیان کی ہو یا کبھی کسی کی غیبت کی ہو۔ لوگوں کی تعریفیں تو مولٰینا کی زبان سے اُن کے پاس بیٹھنے والوں نے سینکڑوں مرتبہ سُنی ہونگی مگر ایک مثال بھی ہمیں اب تک ایسی نہیں ملی، جس میں مولٰینا نے دُوسرے لوگوں کی غیبت کی ہو، یا اُن کو پیٹھ پیچھے بُرا بھلا کہا ہو۔

غیبت سے اجتناب کے متعلق تین وقیع شہادتیں

مولٰینا کی اس عجیب و غریب عادت کا ہر وُہ شخص جسے مولٰینا کی خدمت میں

رہنے یا پاس بیٹھنے کا اتفاق ہُوا ہے، ثنا خواں نظر آتا ہے۔
مثلاً دو ایک شہادتیں پیش کرتا ہوں :۔

پہلی شہادت | آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب جو مولینا کے عزیز اور مشہور اہلِ قلم تھے، اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔
"یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے اور جو لوگ مولینا سے واقف ہیں وُہ اس کی پوری تائید کریں گے کہ مولینا یونانی خیالات کی رُو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیانہ خیالات کی رُو سے ایک صاحبِ باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی بُرائی اُن کی زبان سے نہیں سُنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔" (عصرِ جدید ۲۱ر دسمبر ۱۹۱۷ء)

دوسری گواہی | مولوی محمد یحیٰی تنہا بی۔ اے وکیل مولینا سے اپنی ۱۹۰۹ء کی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہُوئے لکھتے ہیں "آج تک مولینا کی زبان سے کسی کی غیبت نہیں سُنی گئی۔"

تیسرا بیان | جب ۱۹۱۲ء میں مولینا تبدیل آب و ہوا کے لیے فرید آباد تشریف لے گئے ہیں، اُس وقت کے حالات لکھتے ہوئے مکرمی سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی فرماتے ہیں "مدّت العمر کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نے کبھی اپنی زبان کو غیبت اور بدگوئی سے آلودہ نہیں کیا اور مجھے یہ سبق پہلی مرتبہ اُن کی دلچسپ مجلس میں حاصل ہوا کہ اتنے وسیع تعلّقات اور واقفیّت کے باوجود آدمی چاہے تو اپنی ہمہ رنگ و ہمہ گیر گفتگو کو لوگوں کی ہجو بیجا اور مذمّت ذات سے خالی رکھ سکتا ہے۔ (علی گڈھ میگزین بابت مئی ۱۹۲۳ء)

ذاتی طور پر نہایت قانع تھے | مزاج میں استغنا اور قناعت حد سے زیادہ تھی۔ ہوس اور طمع کا اُن کی طبیعت میں ذرا بھی دخل نہ تھا۔ آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

(۱) سچّی قناعت کی ایک روشن مثال

مولٰینا کے استغنا اور سچّی قناعت کی ایک بیّن مثال یہ ہے کہ مولٰینا جب عربک سکول دہلی میں ملازم تھے، اُس زمانہ میں سر آسمان جاہ بہادر حیدرآباد کے مدارالمہام تھے، سر سیّد کی تحریک پر نوّاب سر آسمان جاہ نے ریاست سے پچھتر روپے ماہوار کا وظیفہ مولٰینا حالی کے لیے مقرر کر دیا۔ باوجودیکہ مولٰینا کے پاس کوئی ذاتی نہیں تھی اور حالی سکّے کے پچھتّر روپے کوئی بڑی رقم نہ تھی۔ لیکن اُنہوں نے اپنی گزراوقات کے لیے اُسے کافی سمجھ کر عربک اسکول کی ملازمت سے استعفا دیدیا۔ (یہ وظیفہ بعد میں بڑھ کر سَو روپے ماہوار ملنے لگا تھا۔)

(۲) باوجود مواقع کے حیدرآباد میں کسی عہدے کی خواہش نہیں کی

سر سالار جنگ اوّل مدارالمہام حیدرآباد دکن کی فیاضی اور مردم شناسی کے ساتھ قدر افزائیاں مشہورِ عالم ہیں۔ سر سیّد کا اُن پر پُورا اثر تھا۔

اور جس کسی کی نسبت سر سید سفارش کر دیتے اُسی کو حیدر آباد میں عمدہ جگہ مل جاتی۔ اگر مولینا حالی جھوٹوں کو بھی اشارہ کرتے تو یقیناً اُنہیں حیدر آباد میں اعلیٰ درجہ کا عہدہ مل جاتا، مگر اُن کی غیور طبیعت نے اُسے جائز نہ سمجھا کہ وُہ اپنے لیے خود اس قسم کی کوئی تحریک کریں۔

۳۔ علیگڑھ کالج کی پروفیسری کا کبھی خیال نہیں کیا	محمڈن کالج میں فارسی کی پروفیسری ملنا بھی کوئی دشوار امر نہ تھا۔ لیکن اُنہوں

نے اس کو بھی پسند نہیں کیا کہ وُہ اس کے لیے کوشش کرتے۔ بلکہ اپنی ذات کو قوم کے لیے زیادہ مفید بنانے کی غرض سے آزاد رہ کر قومی خدمت کو زیادہ مناسب سمجھا۔"

(کسوف الشمس صفحات ۶۱-۶۲)

۴۔ مسدّس حالی کی رجسٹری نہیں کرائی	"مسدّس مدّ و جزرِ اسلام" جو اپنی نوعیّت میں ایک نہایت ہی دلچسپ، مفید اور مزیدار کتاب ہے۔

بڑا ثبوت اس بات کا پیش کرتی ہے کہ ہوس اور طمع سے مولٰنا
کو اسی قدر بُعد تھا جس قدر مشرق و مغرب میں فاصلہ ہے کیونکہ
جس قدر مولٰنا کی یہ کتاب پبلک میں مقبول ہوئی جس قدر
شہرت اُسے حاصل ہوئی جس دلچسپی و شوق کے ساتھ لوگوں نے
اُسے پڑھا۔ مختلف زبانوں میں متعدد تراجم جیسے اس کتاب کے
ہوئے، جتنے سینکڑوں ایڈیشن اس کے شائع ہوئے، اتنی
قبولیت، اتنی ہر دلعزیزی اور اس قدر شہرت یقیناً ہندوستان
میں کسی اور کتاب کو ہرگز نصیب نہیں ہوئی۔ انتہا یہ ہے کہ آج
بھی جبکہ اس کتاب کو لکھے ہوئے ستاون برس ہو چکے ہیں اسکی
روزافزوں مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور اس کی
فروخت دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اگر مولٰنا
اس کتاب کی رجسٹری کرا دیتے اور اپنے سوا کسی کو اپنے چھاپنے
کا حق نہ دیتے اور بکثرت چھپوا کر خود ہی فروخت کرتے، تو

کس قدر بے انتہا روپیہ حاصل کر لیتے اور کس قدر کثیر دولت اپنی اولاد کے لیے چھوڑ جاتے، مگر مولینا نے روپے کی قطعاً طمع نہیں کی اور عام اجازت دے دی کہ جو شخص چاہے اسے چھاپے اور فروخت کرے۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ مولینا لکھنؤ تشریف لے گئے، تو ایک تاجر کتب اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیان کیا کہ "میں نے حضور کی مُسدّس اب تک پچاس دفعہ چھاپی ہے اور اس سے کثیر روپیہ کمایا ہے۔"

مولینا کو مسدّس حالی کی رجسٹری کا خیال کیوں آیا تھا؟

بیشک مولینا کو مسدّس حالی کی باضابطہ رجسٹری کرانے کا خیال آیا تھا، مگر اپنی ذات یا اپنی اولاد کے لیے نہیں بلکہ مدرستہ العلوم مسلمانان علیگڈھ کے لیے، تاکہ اُس کی آمدنی قوم کے غریب بچوں کی تعلیم میں صرف کی جائے۔ لیکن مولینا کے اس خیال کی خود سرسید نے مخالفت کی اور مولینا کو لکھا۔ "آپ کے اس خیال کا کہ حق

تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جائے، اور رجسٹری کرادی جائے میں دل سے شکر کرتا ہوں، مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور اُن کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقیّد کیا جائے۔ جس قدر چھپے، اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گائیں۔ قوال درگاہوں میں گائیں۔ حال لانے والے اس سچّے حال پر حال لائیں۔ اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی۔

(خطوط سر سید صفحہ ۱۶۷۔ خط مورخہ ۱۰ جون ۱۸۷۹ء)

قناعت کی بدولت کوئی دولت جمع نہیں کی۔	اس قناعت کا نتیجہ تھا کہ باوجود اعلیٰ پایہ کے مشہور مصنّف ہونے کے مولینا

نے تمام عمر کوئی دولت جمع نہیں کی، اور نہ کچھ اپنے بعد چھوڑا اُن کے پاس بیشک ظاہری طور پر دولت کی افراط نہیں تھی۔ مگر قناعت کے باعث اور ہوس کے نہ ہونے کی وجہ سے

نہ اُن کو دولت کی پروا تھی اور نہ وُہ اُس کے حصول کے لیے
کوشش کرتے تھے، اور اسی بات کی نصیحت ۱۹۰۴ء کی
ایک غزل کے مقطع میں اپنی اولاد کو اس طرح فرماتے ہیں ؎

جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالی تو اس سے دل تنگ نہ ہوں وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وُہ، جو نیّت اُن کی غنی رہیگی

شہرت اور نام نمود سے نفرت

شہرت اور نام نمود کی خواہش بھی مولینا میں
بالکل نہیں پائی جاتی تھی۔ وُہ فی الحقیقت
ایک گوشہ گیر اور تنہائی پسند بزرگ تھے اور نہیں چاہتے تھے
کہ ہر معاملہ میں اپنے آپ کو پیش کریں اور اس طرح اپنی شہرت
اور عزّت کو بڑھائیں ۔

مسلمانوں کی خاموش تعلیمی خدمت

اگرچہ سر سید کے ساتھ اُنہوں نے قومی
کاموں میں نہایت بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔
اور اِس معاملہ میں سر سید کے دستِ راست ثابت ہوئے،

مگر کبھی پیش پیش نہ رہے۔ ہمیشہ نہایت خاموشی کے ساتھ خدمت کی۔ نہ کبھی اس کا اظہار چاہا نہ خود کیا۔

۲۔ شمس العلماء کا خطاب ملنے پر خود مولینا کا خیال

۱۹۰۴ء میں جب انہیں گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا، تو اُس وقت جو خط اُنہوں نے خواجہ سجّاد حسین صاحب کو لکھا ہے، وُہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ مولینا شہرت سے متنفر اور گوشۂ عافیت کے عاشق تھے اور اس حالت میں رہنا پسند کرتے تھے۔ حکام سے ملنا اور اُن کے پاس جانا اُن کو بہت شاق گزرتا تھا۔ چنانچہ اس خط میں جو مولینا نے ۲۲ جولائی ۱۹۰۴ء کو پانی پت سے لکھا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے، جسکی ہمارے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں اور اس کیلئے

ریشہ دوانیاں کرتے ہیں، مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم
ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ
ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔
مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آویگا، یا جب کوئی
نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آویگا، لامحالہ وہاں جانا پڑیگا
آج چوتھا روز ہے، ٹامس صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کی خدمت
میں حسبِ تحریر برخوردار تصدّق حسین کے گیا تھا۔ وُہ چونکہ
نہایت مہذّب اور خلیق ہیں بہت اچھی طرح ملے اور یہ بھی
کہا کہ مَیں آج ہی پانی پت جاتا ہوں، وہاں تفصیلی ملاقات
ہوگی۔ چنانچہ تین روز سے یہاں آئے ہُوئے ہیں اور مَیں
کل اُن سے ملنے جاؤں گا۔ اُنھوں نے میری کتابوں کے
دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے، وُہ بھی ادھر اُدھر سے مانگ
تانگ کر لے جاؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ درگاہ قلندر صاحب

اور کابل باغ وغیرہ عمارات قدیمہ کے دیکھتے وقت مجھے بھی
بُلایا جاویگا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں"؟

۳۔ ایک مشہور اہلِ قلم کی شہادت

مولوی محمد علی مرحوم ایڈیٹر ہمدرد کامریڈ دہلی نے جو شذرہ مولٰینا کے انتقال پر ۳ جنوری ۱۹۱۵ء کے ہمدرد میں لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں اور بالکل بجا فرماتے ہیں کہ "اگر حیاتِ جاوید اور مسدس حالی کا مصنف شہرت پسند ہوتا اور کسبِ شہرت کرتا، تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُس کا نام دُنیاوی اور مادی نقطۂ خیال سے بہت بلند ہوتا۔ لیکن اُس نے کبھی بازار میں بِکنا گوارا نہ کیا، اور مولٰینا حالی کا یہ امتیازی کیرکٹر تھا، جو ہماری قوم میں بہت ہی کم نظر آتا ہے۔ وُہ اپنی وضع اور عزم کے پکّے تھے"۔

۴۔ اپنا شاگرد ہونے سے لوگوں کو روکتے

کسی اُستاد کے جس قدر زیادہ شاگرد ہوں اور وُہ شاگرد جس قدر زیادہ معزز اور مشہور

ہوں، اُسی قدر اُستاد کی شہرت اور عظمت زیادہ ہوتی ہے، اور اُسی قدر اُس کا نام زیادہ مشہور ہوتا ہے لیکن چونکہ مولٰنا نہ شہرت کے بھوکے تھے اور نہ نام نمود کے خواہشمند اس لیے اکثر لوگوں کو جو بڑے شوق اور آرزو کے ساتھ آپ کا شاگرد ہونے کی آرزو کیا کرتے تھے۔ آپ فکرِ شعر سے منع کرتے تھے اور شاگرد نہیں بناتے تھے اور یہ منع کرنا آپ کا محض نصیحتاً ہوتا تھا نہ کہ اس لیے کہ آپ کسی میں فکرِ سخن کی قابلیت نہیں سمجھتے تھے یا اپنے کو بہت بڑا انسان جانتے اور کسی کو اصلاح دینا اپنی شان کے منافی خیال کرتے تھے۔ اگر آپ شہرت پسند ہوتے، تو سینکڑوں نہیں ہزاروں شاگرد بنا لیتے، جو آپ کے نام کو عزّت کے ساتھ ہر طرف شہرت دیتے۔ اس امر کے ثبوت میں مَیں یہاں صرف ایک واقعہ لکھتا ہوں، جو ہزار واقعات کے برابر ہے اور جس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے

کہ حصولِ شہرت کی خواہش مولٰینا کے دل میں نام کو بھی نہیں تھی۔

اِس ضمن میں ایک خاص واقعہ

۱۹۲۸ء کے دسمبر میں مخدومی جناب خواجہ سجّاد حسین صاحب قادیان تشریف لے گئے۔

خاکسار راقم تذکرہ بھی ہمراہ تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیحؑ مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ صاحب سے جس وقت ملاقات ہُوئی، تو حضور نے باوجود علالت کے بڑی خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی کے ساتھ خواجہ صاحب کا خیر مقدم کیا، اور گفتگو کے دَوران میں فرمانے لگے کہ "خواجہ صاحب! میں آپ کے والد کا نہایت ممنون ہوں۔ اُنہوں نے ایک موقع پر مجھے بڑی قابلِ قدر نصیحت فرمائی تھی"۔ جناب خواجہ سجّاد حسین صاحب نے واقعہ پوچھا، تو حضرت خلیفۃ المسیحؑ فرمانے لگے کہ "بچپنے میں مجھے شاعری کا شوق پَیدا ہُوا۔ اس پر میں نے سوچنا شروع کیا کہ شاعر بننے کے لیے کسی اُستاد کی شاگردی اختیار کرنی چاہیئے۔ اب

یہ معاملہ طے کرنا تھا کہ کس کو اُستاد بنایا جائے۔ سوچتے سوچتے آخر مولینا حالی پر دل ٹھکا۔ اِس پر مَیں نے اُنہیں پانی پت خط لکھا کہ مَیں شاعری میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔ اگر آپ منظور فرمائیں، تو آپ کو اپنا کلام اصلاح کے لیئے بھیج دیا کروں؟ کچھ دنوں کے بعد مولوی صاحب کا جواب آیا۔ کہ "میاں صاحبزادے! اپنی قیمتی عُمر کو اس فضول مشغلے میں ضائع نہ کرو۔ یہ عُمر تحصیلِ علم کی ہے۔ پس دل لگا کر علم حاصل کرو۔ جب بڑے ہو گے، اور تحصیلِ علم کر چکو گے اور فراغت بھی میسّر ہو گی، اُس وقت شاعری بھی کر لینا۔" حضرت خلیفۃ المسیح فرمانے لگے کہ "خواجہ صاحب! آج بھی جب مجھے آپ کے والد صاحب کی یہ نصیحت یاد آتی ہے، تو بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے۔" خواجہ صاحب محترم نے جواب دیا کہ "آپ نے ٹھیک فرمایا، یہ والدِ مرحوم کی عادت تھی کہ وُہ ہر شخص کو فکرِ شعر سے

منع کیا کرتے تھے۔"

اس واقعہ سے موجودہ لیڈروں کے لئے ایک درسِ عبرت و نصیحت

میرے نزدیک یہ عظیم الشان واقعہ مولینا کی شہرت پسندی سے نفرت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر آپ میں ذرا سا بھی شہرت پسندی کا مادہ ہوتا، تو آپ بڑے ہی شوق سے مذہبی دنیا کے ایک بہت بڑے انسانؑ کے بیٹے کو (جو ایک دن خود بھی ساری دنیا میں مشہور ہونے والا تھا) اپنا شاگرد بنا لیتے اور اس پر فخر کرتے، مگر آپ نے اس کا خیال بھی نہ کیا۔ اور انہیں صاف جواب دے دیا۔ کاش! قوم قوم پکارنے والے موجودہ لیڈروں میں کیرکٹر کی ایسی مضبوطی پیدا ہو جائے، اور کاش! موجودہ شہرت پسند حضرات نیک نفس حالی کے اس واقعہ سے نصیحت حاصل کریں اور خلوص و صدق سے قوم کی خدمت کرنے کو شہرت پسندی اور نام و نمود کی خواہش پر

ترجیح دیں، مگر افسوس اس کی بہت کم اُمید ہے۔

بیکار باتوں میں وقت ضائع نہ کرتے

لغو اور بیکار باتوں میں اپنے وقت کو برباد کرنے کی عادت مولٰینا میں قطعاً نہ تھی۔ اُن کی مجلس لایعنی ذکروں اور فضول تذکروں سے یکسر پاک ہوتی تھی کبھی جوانی میں بھی نوجوانوں کے محبوب اشغال تاش، چوسر، گنجفہ، شطرنج وغیرہ سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ ایک سادہ اور طالب علمانہ زندگی تھی، جو مولٰینا نے بسر کی۔ ہنسی، ٹھٹھا اور مخول نہ خود کرتے تھے نہ اپنے سامنے ہونا گوارا کرتے تھے۔

خلافِ تہذیب شاعری سے متنفر تھے

حالانکہ خود اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور شاعری کی ابتدا قدیم طرز کی غزل گوئی سے کی تھی، مگر کبھی فحش، خلافِ تہذیب اشعار اور ہزلیات سے اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ بلکہ ایسے ہزل گو شعرا کو نہایت نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وُہ محکمہ جس کا قاضی خُدا ہے مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائینگے سارے
جہنّم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

زمانے میں جتنے قُلی اور نفر ہیں کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں
گویّے امیروں کی نُورِ نظر ہیں ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں

مگر اس تپ دق میں جو مبتلا ہیں
خُدا جانے وُہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سقّے نہ ہوں جی سے جائیں گزر سب ہو میلا جہاں گُم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب جو ٹھہر جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب

پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

اَور اس قسم کی شاعری کے متعلق اُنہوں نے اِس طرح اظہارِ

خیال فرمایا ہے ؎

وُہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر　　عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر　　ملک جس سے شرماتے ہیں آسمان پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وُہ ہے ہف نظر علمِ انشا ہمارا

مزاج میں بہت متانت تھی

علیگڈھ سے جب "اولڈ بوائے" رسالہ نکلا اور مولینا کے پاس بھی آنا شروع ہُوا، تو اُسے پڑھ کر اُنہیں بڑی کوفت ہوتی، اور کئی بار آپ نے تاسّف کیا کہ "مسلمانوں کے علمی مرکز سے ایک رسالہ نکلا، تو وُہ بھی ایسا کہ جس میں سوائے گپ شپ کے کوئی متین مضمون اور کام کی بات نہیں"۔

(علی گڈھ میگزین مئی ۱۹۲۳ء صفحہ ۶۵)

اپنی شدید مخالفت کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے

بہت سے بڑے آدمیوں میں یہ بڑا عیب نہایت نمایاں طور پر دیکھا گیا ہے

کہ وہ چاہے کتنے ہی بااخلاق اور حلیم الطبع ہوں۔ مگر اپنی مخالفت کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتے۔ جہاں کسی نے ذرا بھی اُن کی کسی بات میں ادنیٰ سی بھی مخالفت کی (خواہ وُہ ولی ہمدردی اور خالص نیک نیتی سے بھی کی جائے) بس فوراً ؎

کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پھلاتے کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں منہ پہ لاتے
کبھی خوک اور سگ ہیں اُسکو بتاتے کبھی مارنے کو عصا ہیں اُٹھاتے

مولینا ملک کے معزز ترین طبقہ میں کمال عزّت و احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے اور ہزاروں اشخاص آپ سے نہایت عقیدت اور ادب سے پیش آتے تھے۔ مگر باوجود اس عزّت و رفعت کے مولینا اپنی مخالفت کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے، اور بالکل بُرا نہیں مانتے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں جب مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے علیگڈھ

سے "اُردوئے معلّٰی" جاری کیا، تو جدید شاعری کے اس مجدّدِ اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولینا کے پاس اگرچہ "اُردوئے معلّٰی" باقاعدہ پہنچتا تھا۔ مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

ایک اثرانگیز تاریخی واقعہ

علیگڈھ کالج میں کوئی عظیم الشّان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولینا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسبِ معمول سیّد زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولینا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ اِن مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور "اُردوئے معلّٰی" کے دو تین پرچے

اُٹھالائے۔ حسرت اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے۔ مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کئے اور مولینا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور "اُردوئے معلّیٰ" کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور "واہ! خوب لکھا" کہہ کر داد دیتے تھے۔ حالی بھی ہوں ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے، مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے "ارے مولینا! یہ دیکھئے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے؟ اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کئے۔" سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرّبِ زبان کوئی ہو نہیں سکتا، اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اُردو کی خدمت سے روکیں۔ اتنا اچھا ہے، فرشتہ منش حالی

ذرا مکدّر نہیں ہُوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ "نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں"

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پُوچھا کہ "حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ "جو کچھ لکھ چکا ہوں اُسی کا ملال اب تک دل پر ہے" (رسالہ زمانہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۹ء جلد ۱۱ نمبر ۶ صفحہ ۲۹۸ تا ۲۹۹)

ایذا رسانی اور دشنام طرازی پر صبر کرتے	مخالفت پر بُرا نہ ماننا بیشک ایک محمود صفت ہے، مگر مولینا کا قدم اس سے بھی آگے ہے

آپ نہ صرف یہ کہ مخالفت پر بُرا نہیں مانتے تھے بلکہ دشنام دہی اور ایذا رسانی پر نہایت استقامت کے ساتھ صبر بھی کرتے تھے مسدّس کی تصنیف اور سر سید کی طرفداری و رفاقت کی وجہ سے مخالفت اور دشمنی کا ایک زبردست طوفان مُلک میں اُن کے خلاف کھڑا ہوا۔ خالی، خیالی، ڈھالی جیسے سنجیدہ حریف اُن کے

زیر کرنے کو اکھاڑے میں اُتارے گئے۔ علی گڈھ، لکھنؤ، گورکھپور، دہلی اور لاہور سے مہینوں بلکہ برسوں اُن پر نہایت سوقیانہ الفاظ میں آوازے کسے جاتے رہے۔ جب ۱۸۹۳ء میں دیوان اور مقدمہ شعر و شاعری شائع ہُوا تھا تو اُس نے پرستارانِ طرزِ قدیم کے خرمنِ عقل و ہوش پر بجلی کا کام کیا وہ اپنے آپے میں نہ رہے اور نہایت خلافِ تہذیب اور بازاری الفاظ میں مولینا کو کوسنا شروع کیا۔ دیوان اور مقدمہ کی ایک ایک سطر پر فضول اور لایعنی اعتراضات کی بارش شروع کر دی، اور مدتوں نہایت استقلال کے ساتھ اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اودھ پنچ لکھنؤ میں جو سلسلۂ اعتراضات ۳۳ مہینے تک مسلسل شائع ہوتا رہا اُس کا عنوان یہ شعر تھا۔ ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

مولینا حالی سب کچھ سُنتے اور پڑھتے تھے، مگر نہایت صبر کے

ساتھ برداشت کرتے تھے اور کبھی کوئی ایک مضمون بھی آپ نے ایسے لوگوں کے خلاف کسی اخبار میں نہیں لکھا۔ بلکہ جب اودھ پنچ کے جواب میں استاذی المحترم جناب مولینا خواجہ غلام الحسنین صاحب نے ایک سلسلۂ مضامین لکھنے کا ارادہ کیا اور مولانا کو معلوم ہُوا، تو آپ نے بہت سختی سے اُن کو روک دیا اور فرمایا کہ "اسکی ہرگز ضرورت نہیں۔ لکھنے دو جو وُہ لکھتا ہے اور بالکل خاموش رہو"

ناگوار طبع خطوط کا جواب نہ دینے | پبلک طور پر اخباروں اور رسالوں میں آپ کو بُرا بھلا کہنے کے علاوہ جب لوگ پرائیویٹ خطوط میں آپ کو ایسی باتیں لکھتے تھے جو نہایت ناگوار طبع ہونی چاہئیں تب بھی آپ اُن کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب آپ کو شمس العلماء کا خطاب گورنمنٹ کی طرف سے ملا، تو اُس کی مبارکباد دیتے ہُوئے مولوی محرم علی چشتی مرحوم وکیل ہائیکورٹ لاہور اپنے ۲۹ جون ۱۹۰۴ء کے خط میں مولینا کو

لکھا کہ "غالباً آپ اس امر کو ملحوظ رکھیں گے کہ نیچری پارٹی کے ساتھ شمولیت رکھنے میں جو غلطیاں آپ سے سرزد ہوئی ہیں۔ اُن کی تلافی اپنی قیمتی زندگی کے اس (آخری) حصّہ میں آپ ضرور فرمائیں تاکہ دُنیاوی شمس العلمار بننے کے علاوہ آپ حقیقی اَور دینی معنوں میں بھی یوم الحساب کو شمس العلمار اور شمس الامّت سمجھے جائیں "۔ یہ نصیحت چاہے کتنی ہی نیک نیتی اور خیر خواہی کے ساتھ کی گئی ہو، مگر ظاہر ہے کہ ایک ایسے شخص کے لیے ضرور ناگوارِ طبع ہو سکتی ہے جس نے اپنی تمام زندگی ہی " بقول صاحب خط کے نیچری پارٹی کے ساتھ شمولیت رکھنے میں" وقف کر دی ہو مگر باوجود اس کے جہاں تک معلوم ہے مولٰینا نے اس تحریر کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اپنی غلطی فوراً تسلیم کر لیتے تھے	دَورِ موجودہ کے وُہ بزرگ جن کے فرمودہ پر سینکڑوں اشخاص آمنّا وصدّقنا کہنے کو تیار ہوں بہت

کم ایسا ہوتا ہے کہ وُہ اپنی غلطی کو تسلیم کریں اور ہٹ دھرمی اور اپنی بات کی پیچ سے باز آ جائیں۔ مگر ہمیں مولٰینا کا دامن اس عیب سے بھی پاک نظر آتا ہے۔ چنانچہ خود مجھ سے منشی محمد دین صاحب کاتب دہلوی نے بیان کیا کہ "جب ۱۸۹۳ء میں مولٰینا نے مجھے اپنا دیوان اور اُس کا مقدمہ کتابت کرنے کے لیے دیا تو مَیں نے اُسے دیکھ کر مولٰینا کی خدمت میں عرض کیا کہ "حضرت! عبارت میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں سہواً رہ گئی ہیں" اور جب میں نے وُہ غلطیاں مولٰینا کے سامنے رکھیں تو مولٰینا نے اُنہیں دیکھ کر فرمایا۔ "بیشک منشی صاحب! واقعی یہ غلطیاں مجھ سے ہو گئی تھیں۔ آپ کا بڑا احسان ہے کہ آپ نے ان غلطیوں کی طرف مجھے توجہ دلائی۔ ورنہ کتاب میں بڑا نقص رہ جاتا۔ مَیں آخر انسان ہوں اور انسان سے غلطیوں کا سرزد ہونا لازمی بات ہے۔" منشی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جب کبھی

کسی مجلس میں مولٰینا مجھ سے ملتے تو حاضرین سے اس امر کا ضرور تذکرہ فرماتے اور کہتے کہ "میں منشی صاحب کا نہایت ممنون ہوں کہ اُنھوں نے میری غلطیوں کی طرف مجھے توجّہ دلائی"۔ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا، مگر مولٰینا اس کا اعتراف کرنے میں کبھی نہ شرماتے"۔

نہایت منکسر المزاج تھے مزاج میں انکساری اور فروتنی بے حد تھی۔ کبھی مولٰینا نے یہ خیال نہ کیا کہ میں بڑا آدمی ہوں اور سارے ہندوستان میں میری قدر و عزّت ہے، بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو معمولی آدمی سمجھا، اور دراصل یہی بڑا ہونے اور بڑا بننے کا راز ہے۔ چنانچہ اپنے ایک عزیز خواجہ تصدق حسین صاحب (مرحوم) کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :-

"جب میں زمانہ کی نگاہ میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ کرتا ہوں، تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک مشہور گویّا جہاں

کہیں جاتا ہے، اُمراء اُس کی خاطر کرتے ہیں اور اگر وُہ خود
نوکری چاہتا ہے، تو تھوڑی بہت نوکری بھی ہر جگہ اُس کو
مل جاتی ہے، لیکن اگر وُہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور
عزیزوں کی سفارشیں کرنی اختیار کرے، تو کوئی اُس کی
طرف اصلا التفات نہیں کرتا۔ یہی حال میرا ہے۔ اگر میں
خاص اپنی ذات کے لیے کہیں جا کر کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہوں
تو شاید کسی قدر کامیابی ہو جائے۔ لیکن یہ ہرگز اُمید نہیں
کہ میری سفارشوں کی بھی ایسی ہی قدر و پرسش ہو، جیسی
مجھ کو اپنی قدر و پرسش کی اُمید ہے۔"

(خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۸۹ء)

ہوس اور طمع مولینا کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اُن کی زندگی قناعت کی ایک بہترین مثال تھی۔	مزاج میں طمع بالکل نہیں تھی

اور ہمارے لیے لائق عمل۔ چنانچہ اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ

جب حیدر آباد سے وظیفہ ہو کر حصولِ معاش کی طرف سے بے فکری اور اطمینان ہو گیا، تو آپ نے فوراً عربک سکول دہلی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور گوشۂ عافیت میں مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ اگر چاہتے تو مسدّس اور اپنی دُوسری قابلِ قدر تصنیفات کی بدولت بہت کافی دولت کما سکتے تھے۔ مگر اُنہوں نے قناعت کی دولت پسند کی اور مسدّس جیسی مقبولِ عام کتاب کو بھی تین مرتبہ سے زیادہ خود نہ چھپوایا۔

نہایت سیر چشم اور عالی حوصلہ تھے	ہوس اور طمع کے فقدان کے ساتھ سیر چشمی، فراخ حوصلگی اور عالی ظرفی کا مادہ قدرت نے

بڑی فیاضی کے ساتھ آپ کو مرحمت فرمایا تھا، جس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ سینکڑوں تاجر کتب آپ کی مقبولِ عام نظمیں اور کتابیں بغیر آپ کی اجازت کے چھاپ لیا کرتے تھے، مگر آپ نے کبھی ایک مرتبہ بھی ایسے لوگوں سے کسی قسم

کا کوئی تعرض نہیں کیا اور جب کسی نے آپ سے آپ کی کسی نظم یا کتاب کی اشاعت کی اجازت مانگی، تو آپ نے بڑی دریا دلی کے ساتھ فوراً اُسے اجازت دے دی۔ چنانچہ جب مولوی نظام الدین صاحب ایڈیٹر "ذوالقرنین" بدایوں نے مولینا سے اُن کی چند رُباعیاں چھاپنے کی اجازت طلب کی تو مولینا نے اس کے جواب میں مندرجۂ ذیل خط لکھا:۔

جنابِ من!

آپ شوق سے ان رباعیوں کو جو علیگڈھ گزٹ میں چھپی ہیں "ذوالقرنین" میں چھاپ لیں، اور جو رُباعیاں دیوان میں مَوجُود ہیں اور منشی رحمت اللہ رعدؔ اُن کو چھاپ چکے ہیں اُن کو آپ بھی چھاپ سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ کوئی تازہ کلام ان کے سوا اِس وقت موجود نہیں ہے۔ میری داہنی آنکھ میں پانی اُتر آیا ہے۔ اوائل اپریل میں قدح کرانے کی

غرض سے لکھنؤ جانے کا ارادہ ہے، لکھنا پڑھنا تقریباً
بالکل بند ہے۔ اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے۔ زیادہ نیاز
خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت
۲۵ مارچ ۱۹۰۷ء

پورے طور پر دیانتدار تھے

دیانتداری، قانون اخلاق کی ایسی مشکل اور اہم دفعہ ہے کہ ملک کے بڑے بڑے لیڈر بھی اس پر عمل نہ کر سکے اور بارہا اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ مگر مولینا اس پر پورے طور سے عامل تھے۔ معاملات میں اُن کی دیانتداری یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ آخر عمر میں جب آنکھوں کی کمزوری کے باعث خود لکھنا پڑھنا بالکل ترک ہوگیا تھا، تو آپ اُن اخباروں اور رسالوں کو بالعموم واپس کر دیا کرتے تھے جو اطرافِ ملک سے ایڈیٹر صاحبان، آپ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ جب مولوی

ابوالکلام صاحب آزاد نے کلکتہ سے "الہلال" نکالا اور مولینا کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا، تو مولینا چونکہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے۔ لہٰذا پرچوں کو انکاری لکھوا کر واپس فرماتے رہے۔ جب اس کی خبر مولوی ابوالکلام آزاد کو ہوئی، تو اُنہوں نے مولینا کو مندرجہ ذیل خط لکھا:-

"یا جناب الجلیل الاعز

انعم اللہ علی بقائکم۔ دفتر سے معلوم ہوا کہ "الہلال" کے جو پرچے خدمتِ عالی میں جاتے ہیں بجنسہٖ واپس آتے ہیں۔ ایک پرچہ مَیں نے بھی دیکھا، اُس پر لکھا تھا کہ مکتوب الیہ کو لینے سے انکار ہے۔ ؎

خواہی کہ بتو بیش شعو شوق نظری   در پیش خود نگاہ براں گاہ نگہ دار

میرے دل عقیدت کیش کے لیے تو اتنی نسبت بھی بہت ہے کہ آستانۂ مبارک تک "الہلال" پہنچے اور محروم واپس آئے تاہم

اِس بے التفاتی کا سبب معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہوں۔

میں نے بیشتر ہی عرض کر دیا تھا کہ حاضری سے ادارت کیشوں کو نہ رہ گئے۔ ردّی کے ٹوکرے میں تو آخر جگہ مل ہی سکتی ہے؟

جب کبھی کلکتہ سے نکلتا ہوں تو ارادہ کرتا ہوں کہ آستانۂ مبارک پر عتبہ بوسی کے لیے حاضر ہوں لیکن محرومی پہنچنے نہیں دیتی۔ شاید اواخر دسمبر میں پانی پت حاضر ہوں۔ گو ڈرتا ہوں کہ "الہلال" کی طرح میرے دلِ عقیدت کی قبولیت سے بھی انکار نہ ہو"

رشتہ داروں کے ساتھ نہایت حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے

اکثر اشخاص کو دیکھا گیا ہے کہ جب خدا نے اُن کو عزت اور رتبہ عطا فرمایا اور وُہ کسی بڑے عہدے پر پہنچ گئے، تو پھر اپنے غریب رشتہ داروں کی امداد کرنا تو بڑی بات ہے، اُن سے بات تک کرنا

وُہ اپنی ہتک اور توہین سمجھتے ہیں۔ مگر مولانا رشتہ داروں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنے میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے. جہاں تک اُن کے بس میں ہوتا، جب تک اُن سے ممکن ہوتا اور جتنا کچھ وُہ کر سکتے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی امداد واعانت اور اُن کی دستگیری میں کسر نہ اُٹھا رکھتے۔ ہر ایک شخص کے لیے ایسی ہی دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ کوشش کرتے تھے۔ جیسی انسان اپنی اولاد کیلئے کیا کرتا ہے ملاحظہ ہو ایک خط میں اپنے ایک عزیز کے متعلق خواجہ تصدّق حسین صاحب کو لکھتے ہیں :-

"اس بات کی بھی مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے کہ وُہ اپنی قدیم عادتیں چھوڑیں یا نہ چھوڑیں، اور اپنی بیوی بچّوں کی خبر لیں یا نہ لیں، اور اپنے باپ دادا کا چلن اختیار کریں یا نہ کریں مَیں بہر حال اُن کی اعانت کرنے کو موجود ہوں" (از خط مورخہ ۵ا فروری ۱۸۹۵ء)

چشم پوشی اور درگزر میں اپنی نظیر آپ تھے

اغماض چشم پوشی اور درگذر کی عادت مولٰینا میں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی کسی کا عیب دیکھ پاتے تو کبھی اشارۃً یا کنایۃً اُس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیتے کہ مجھے بھی تمہارے عیب کی خبر ہے۔ اُن کے ملازم عطاء اللہ نے مجھ سے بیان کیا کہ "مولٰینا کی چائے کے لیے بسکٹ اور چینی بکثرت آیا کرتی تھی اور میرے پاس صندوق میں رکھی جایا کرتی تھی۔ دن یا رات میں جب بھی میرا دل چاہتا صندوق میں سے بسکٹ نکال کر کھا لیا کرتا اور چار پانچ ہی دن میں ایک روپیہ کے بسکٹ ختم ہو جایا کرتے تھے۔ جب بسکٹ ختم ہو چکتے تو میں مولٰینا سے کہتا کہ بسکٹ ختم ہو گئے ہیں۔ مولانا اشارے سے فرماتے کہ "اچھا اور منگا دیں گے" (اشارے سے اس لیے عطاء اللہ بہرا تھا) مگر کبھی ایک دفعہ بھی مجھ سے مولٰینا نے یہ نہیں پوچھا کہ ابھی تو بسکٹ آئے تھے، کہاں چلے گئے؟"

حالانکہ مولینا خوب سمجھتے اور جانتے تھے کہ ہر وقت بسکٹ کھاتے رہنے اور چینی کا شربت بنا کر پینے کے سوا عطاء اللہ کو اور کچھ کام نہیں لیکن باوجود اس کے چشم پوشی کی انتہا دیکھو کہ کبھی نہ مولینا اُس پر ناراض ہوئے، نہ اُسے تنبیہہ کی اور نہ اُسے اس تغلّب سے منع کیا چشم پوشی اور درگزر کی یہ انتہا تھی۔

نہایت خوش سلیقہ اور منتظم تھے

کفایت شعاری اور جزرسی اگر کنجوسی کی سرحد سے نہ ٹکرائے، تو نہایت عمدہ اور محمود صفت ہے۔ مولینا اس صفت کے پورے حامل تھے، وہ نہ فضول خرچ تھے اور نہ کنجوس، بلکہ محدود آمدنی میں نہایت سلیقے اور عمدگی کے ساتھ اپنا گزارہ کرتے تھے۔ مولینا کی زندگی میں اکثر آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "مولینا جس خوش سلیقگی سے اُس وقت رہتے تھے جب کہ اُن کی آمدنی بہت ہی محدود تھی، اُسی عمدگی کے ساتھ اب بھی جبکہ اُنکی آمدنی (حیدرآباد

کے وظیفہ کی وجہ سے) نسبتاً بہت بڑھ گئی ہے رہتے ہیں"۔
(رسالہ زمانہ بابت ماہ جولائی ۱۹۱۳ء صفحہ ۲۸) مطلب یہ ہے
کہ مولینا میں کفایت شعاری اور حسنِ انتظام کا مادہ بہت زیادہ
تھا اور یہی وجہ آمدنی میں اس قدر برکت کی تھی۔

ہر ایک کے متعلق نہایت	حسنِ ظن ایک ایسی صفت ہے، جو اسی
حسن ظنی سے کام لیتے	شخص میں پیدا ہو سکتی ہے، جس کا دل

کھوٹ سے خالی ہو۔ وہی آدمی دوسروں کو ایماندار اور نیک
سمجھ سکتا ہے، جس کی اپنی زندگی بے ایمانی اور شرارت سے خالی
ہو۔ جو خود ایماندار اور شریف نہیں وہ لازماً دوسروں کو بھی اپنے
جیسا بے ایمان، دغا باز، فریبی اور عیار سمجھتا ہے۔ اسی مضمون
کو مولینا اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ ؎

میں بتاؤں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے
جو ہیں خود اچھے وہ اوروں کو نہیں کہتے بُرا

ایک دُوسرے موقع پر کس خوبی کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

نیکوں کو نہ ٹھیرائیو بد اے فرزند
اک آدھ ادا اُن کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہو اُس میں اگر گلے سڑے دانے چند

ایک دُوسری جگہ اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

موجود ہنر ہوں ذات میں جسکی ہزار
بدظن نہ ہو عیب اُس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر
کر حُسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

جو کچھ مولینا نے ان اشعار میں فرمایا ہے وُہ خود بھی اس پر پورے طور سے عامل تھے۔ ہر شخص کے متعلق نیک گمان کرتے تھے اور اگر کسی کا عیب اُن کے سامنے بیان کیا جاتا، تو مولینا کی عادت میں یہ بات داخل تھی کہ کمال حُسنِ ظن کے ساتھ اُس کے عیب کی نہایت نرم اور خوشنما تاویل کرتے تھے۔ ہر ایک کی طرف اپنے دل کو صاف رکھتے اور سب کو نیک سمجھتے تھے۔ افسوس! اب ایسے

قابلِ تعظیم بزرگ کہاں ہیں؟ صدیوں چکّر کھانے کے بعد کہیں زمانہ ایسے بے نفس وجود پیدا کرتا ہے۔ کاش ہم اُن کے اعمال سے نصیحت اور موعظت حاصل کر کے اپنے اخلاق درست کرنے کی طرف راغب ہوں۔

نوکروں سے نہایت اعلیٰ سلوک کرتے

اپنے ملازمین اور نوکروں کے ساتھ جو برتاؤ مولٰینا کا تھا، وہ درحقیقت پڑھنے کے قابل اور عمل کرنے کے لائق ہے۔ مولٰینا اپنے ملازمین کو اپنے بیٹوں کی طرح رکھتے اور اُن سے نہایت شفقت اور محبّت کا سلوک کرتے۔ نہ کبھی اُن کو جھڑکتے، نہ اُن پر چیختے چلّاتے۔ نہ کبھی کسی نے اُن کو اپنے کسی ملازم کو گالی دیتے یا بُرا کلمہ کہتے سُنا۔ مَیں نے خود مولٰینا کے ملازمین سے مولٰینا کے برتاؤ کے متعلق دریافت کیا، تو سب نے متفقہ طور پر اُن کے حُسنِ سلوک کی بے انتہا تعریف کی۔

ا۔ نانوخاں کی زبانی | نانوخاں تو اکثر مولینا کا ذکر کرتے کرتے رونے
لگتا تھا۔ ایک واقعہ اُس نے مجھے بارہا سُنایا کہ "جس زمانے میں
مولینا دہلی میں قیام پذیر تھے تو ایک مرتبہ نواب صاحب لوہارو
کے ہاں اُن کی دعوت تھی۔ کھانا رات کا تھا۔ اُس زمانے میں
مٹّی کا تیل نیا نیا چلا تھا اور سرسوں کے تیل کی جگہ آہستہ آہستہ
قبضہ جماتا جا رہا تھا۔ مولینا نے بھی پیتل کی ایک ڈبیہ روشنی
کے لیے خریدی تھی۔ لیکن چونکہ وُہ ٹپکتی تھی۔ لہذا مولانا نے اُسکو ایک
رکابی میں رکھا ہُوا تھا۔ تاکہ تیل سے فرش وغیرہ خراب نہ ہو۔
شام ہو چکی تھی، کسی ضرورت سے کوئی شخص ڈبیہ اُٹھا کر لے گیا۔
اور جو تیل ڈبیہ میں سے ٹپک ٹپک کر خارج ہوتا رہا۔ سارے کا
سارا رکابی میں جمع تھا۔ یہ ڈبیہ والی رکابی اتفاق سے چولھے کے
پاس رکھّی ہوئی تھی۔ نانوخاں جو باہر سے آئے اور اُنھوں نے
رکابی کو اُٹھا کر دیکھا۔ سمجھے پگھلا ہُوا اعلیٰ درجہ کا گھی ہے۔

سوچنے لگے کہ گھی پینے کا اس سے عمدہ موقع اور کونسا آئیگا؟
جھٹ مُنہ سے لگا۔ غٹ غٹ پی گئے۔ بعد میں جب رکابی
میں سے کچھ بدبُوسی آئی، تو اپنی حماقت کا احساس ہُوا۔ مگر اب
کیا ہو سکتا تھا۔ تیل پیٹ میں پہنچ چکا تھا اور اب کسی طرح
اُسے نکالنا ممکن نہ تھا۔ دوڑے دوڑے میاں نانوخاں مولٰینا
کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ "حضور غضب ہو گیا۔ لیجئے
مَیں تو اب مرا۔ میرا کہا سُنا معاف کر دینا۔ ہائے ہائے!
پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔" مولٰینا نے گھبرا کے پُوچھا۔
"کیا ہُوا؟" تب آپ نے اپنی ساری کارستانی سُنائی۔ چونکہ
مٹّی کا تیل نئی ایجاد تھی اور اُس کے خواص وغیرہ سے پورے
طور پر ابھی ہندوستانی واقف نہ ہُوئے تھے۔ لہٰذا مولٰینا
بھی درحقیقت گھبرا گئے اور سوچنے لگے کہ خبر نہیں کیا نتیجہ
ہو؟ فوراً مولٰینا نے حکیم کو بلوایا اور بڑی توجّہ اور نہایت انہماک

کے ساتھ میاں نانو خاں کی دوادارو شروع کی۔ ابھی مولٰینا
اسی دوڑ دھوپ میں مصروف ہی تھے کہ نواب صاحب کا آدمی
مولٰینا کو بُلانے کے لیے آیا۔ آپ نے اُس کے ہاتھ نواب
صاحب کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ "ضرور حاضر ہوتا۔ مگر
نانو خاں نے تیل پی لیا ہے اَور مَیں اُس کی دیکھ بھال میں
مصروف ہوں اور اس عذر کے لیے شرمندگی کے ساتھ
معافی خواہ ہُوں۔" چنانچہ مولٰینا دعوت میں نہیں گئے، اَور
محض ایک ملازم کی خاطر ایک رئیس کی دعوت کو رد کر دیا۔"
مجھ سے یہ واقعہ نانو خاں کے علاوہ مخدومی غلام السبطین صاحب
نے بھی دو دفعہ بیان کیا۔

ایک مرتبہ سردی کا موسم تھا۔ نانو خاں کو دیکھا کہ سردی
میں سُو سُو کرتا پھر رہا ہے۔ پوچھا۔ نانو خاں! سردی کا کوئی کپڑا
اب کے نہیں بنایا؟ نانو خاں نے کہا۔ "حضور کہاں سے بناؤں؟

خرچ میں گنجائش ہی نہیں"۔ اس پر مولینا نے فوراً اپنی نئی روئی کی واسکٹ اُتار کر اُسے دے دی اور فرمانے لگے۔" لو اسے پہن لو"۔

بڑے جوش کے ساتھ نانو خاں کہا کرتا تھا کہ "مولوی صاحب ولی آدمی تھے اور ایسے آدمی اب ڈھونڈے نہیں ملتے"۔ میں نے ایک دفعہ اُس سے پوچھا کہ "کبھی غصّہ میں مولینا تم پر ناراض بھی ہوئے؟ کہنے لگا۔ ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ مولینا نے نہ کبھی کوئی گالی دی۔ نہ کبھی غُصّے ہوئے"۔ افسوس ہے کہ ۱۷ جنوری ۱۹۳۴ء کو عین عیدالفطر کے روز مولینا کے اس قدیم ملازم کا انتقال ہوگیا۔

مولینا کا دُوسرا ملازم عطاءاللہ

عطاءاللہ ایک دُوسرا ملازم مولانا کا تھا، جو اوجھانی ضلع بدایوں کا رہنے والا تھا اور دن رات مولینا کے پاس ہی رہتا تھا۔ خیر سے ذرا اس کا حلیہ بھی

سُن لیجئے۔ میاں عطاء اللہ کانوں سے بہرے، ہاتھوں سے لُنجے اور پیروں سے لنگڑے واقع ہوئے تھے۔ آنکھوں میں بھی کچھ نقص تھا۔ نہایت مشکل سے بات سمجھتے اور سُننے تو بہت ہی کم تھے۔ مزاج میں غصّہ اور تیزی حد سے زیادہ تھی۔ کیا مجال تھی کہ کوئی کڑی بات کہے۔ سخت جاہل، بلکہ اجہل تھے ہر ایک سے لڑنے مرنے کو ہر وقت تیار اور ذرا سی بات بھی ہو جائے، تو چیخ چیخ کر سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیتے۔ غرض کیا بتاؤں میاں عطاء اللہ عجیب و غریب عادات اور حیران کن شکل وصورت کا نفرت انگیز نمونہ تھے۔ مگر مولینا کی طبیعت اور عادت پر بے اختیار آفریں کہنے کو دل چاہتا ہے کہ اُنھوں نے انتقال کے وقت تک اُس کو اپنے سے علیحدہ نہیں کیا اور اُس کی ہر وقت کی بدمزاجیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ حالانکہ اچھّے سے اچھا اور قابل ملازم مولینا کو ہر وقت

مل سکتا تھا۔ مگر مولٰینا نے اس لنگڑے لُولے اور بہرے ملازم
کے ساتھ ساری عمر گزار دی اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر
نہ لائے۔ نہ اُسے علیحدہ کیا۔ نہ کبھی اُس پر ناراض ہوئے اور
نہ اُس سے کبھی کوئی باز پُرس کی۔ مولٰینا کی زندگی میں ایک
صاحب نے جب عطاء اللہ کی یہ ہیئت اور مولٰینا کا اُس سے
یہ برتاؤ دیکھا، تو ازراہِ ظرافت کہنے لگے کہ "اگر عطاء اللہ خوش
قسمتی سے بالکل اندھا بھی ہوتا، تو بلا مبالغہ مولٰینا کے
نقطہ خیال سے اُس میں ایک اور خُوبی کا اضافہ ہو جاتا۔"

۲۔ عطاء اللہ کی زبانی۔ اِس "ہمہ صفت موصُوف" ملازم کے ساتھ مولٰینا
کا جو سلوک تھا، اُسے خود اُسی کی زبان سے
سُنیئے۔ ایک مرتبہ مَیں نے اُس سے مولٰینا کے متعلق پوچھا
تو نہایت سادگی کے ساتھ کہنے لگا کہ "جی تم سے کیا کہوں۔
مولوی صاحب بڑے ہی اچھے آدمی تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی

چیز بازار سے منگائی اور روپیہ دیا۔ مَیں نے باقی کے پیسے لاکر دئے، تو کبھی پیسے گنے نہیں، بلکہ اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کو چائے پینے کی بہت عادت تھی اور اس کے لیے چینی اور بسکٹ بکثرت آتے رہتے تھے چونکہ مَیں ہی چائے تیار کیا کرتا تھا۔ لہٰذا بسکٹ وغیرہ میری ہی کوٹھڑی میں ایک صندوق میں رکھّے رہتے تھے۔ میرا جب دل چاہتا یا بھوک لگتی، تو بسکٹ نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ گرمی کا موسم ہوتا، تو چینی کا خوب شربت کیا کرتا تھا اور اسی طرح چینی بھی جلدی ختم ہو جاتی اور بسکٹ بھی۔ جب کوئی چیز نہ رہتی، تو مَیں مولوی صاحب سے کہتا کہ مولوی صاحب! چینی نہیں رہی یا بسکٹ ہو چکے، تو مولوی صاحب مجھ سے اشارے سے کہتے کہ "اچھا اور منگائیں گے"۔ (کیونکہ عطا اللہ خیر سے بہت اونچا سُنتے تھے اور بہت ہی کم کوئی بات اُن کی سمجھ میں

آتی تھی) کبھی اُنہوں نے یہ بات نہیں کہی کہ ابھی تو چیز منگائی تھی، اتنی جلدی کس طرح ختم ہوگئی؟ غرض نہ کبھی صندوق کو دیکھتے اور نہ کبھی مجھ سے کچھ پُوچھتے۔ ہمیشہ ایسا ہوتا کہ اپنے پہننے کے کپڑے مجھے دے دیتے اور کہتے پہن لو۔

ایک دن سردی کے موسم میں مَیں نے شکایت کی کہ مولوی صاحب رات کو بہت سردی لگتی ہے۔ مولوی صاحب نے فوراً اپنی رضائی جو ابھی ابھی نئی بنوائی تھی، کھونٹی پر سے اُتار کر مجھے دے دی۔ مَیں نے کہا "مولوی صاحب! یہ تو آپ کی رضائی کل ہی آئی ہے، مجھے کوئی پُرانی رضائی دے دیں۔ کہنے لگے نہیں لے جاؤ۔ ہم اور بنوالیں گے"۔

یہ بیان کرتے کرتے غریب عطاء اللہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ مولٰنا کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گیا۔

۳- مامی کی زبانی | مامی نامی ایک غریب بڑھیا عورت کو مولٰنا

نے رہنے کے لیے اپنے مکان کا ایک حصّہ دے رکھا تھا۔
ماٰمی کچھ چھوٹا موٹا کام بھی کبھی کبھی گھر کا کر دیا کرتی تھی۔ اُس
سے میں نے مولینا کے متعلق پوچھا، تو کہنے لگی۔ "مولوی صاحب
غریبوں سے بھی بڑی اچھی طرح ملتے اور بہت خیرات کرتے
رہتے تھے۔ جب کبھی میں اُن کے پاس جاتی۔ میرے سلام
کرنے سے پہلے خود مجھے سلام کرتے۔ بہت اخلاق سے باتیں
کرتے اور کہتے بیٹھ جاؤ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں جاتی تو عطا اللہ
کو اشارہ کرتے کہ اسے ایک روپیہ دے دو۔ غرض غریبوں
کی بہت مدد کرتے رہتے تھے۔ بعض دفعہ کہتے "ماٰمی! آج تو
مچھلی کو دل چاہ رہا ہے۔ پکا کر لاؤ۔ میں تیل میں مچھلی پکا کر
لے جاتی تو رغبت سے کھاتے اور کہتے بہت اچھی پکائی ہے
گھر والے مجھ پر ناراض ہوتے اور کہتے "مولوی صاحب کو تیل
کی مچھلی کھلا دی۔ اگر خدانخواستہ نقصان دیا تو تیرا کیا بگڑے گا،

اُن کی تو طبیعت خراب ہو گی"۔ مَیں نے کبھی کوئی بُرا کلمہ یا گالی اُن کی زبان سے نہیں سُنی۔ اپنے ملازموں سے بہت محبّت، درگزر اور احسان کا سلوک کرتے۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا کہ عطاءاللہ اُن پر ناراض ہونے لگتا اور دیر تک بڑبڑاتا رہتا۔ لیکن مولوی صاحب اُس سے کچھ نہ کہتے، اور بالکل چُپکے ہو جاتے۔ مَیں آ جاتی، تو کہتی کہ مولوی صاحب آج عطاءاللہ کو غصّہ چڑھ رہا ہے۔ کہتے "ہاں بھئی مامی! کبھی ہم اس پر ناراض ہو لیتے ہیں۔ کبھی یہ ہم پر ناراض ہو لیتا ہے۔ آج اس کی باری ہے۔ اچھا خیر ہمارا کیا ہرج ہے ناراض ہو لینے دو"۔ کبھی اگر عطاءاللہ بیمار ہوتا تو مولوی صاحب فوراً ڈاکٹر یا حکیم کو بلا کر عطاءاللہ کو دکھاتے اور بہت اچھّی طرح اُس کا علاج کراتے۔ اگر بیماری کچھ زیادہ ہوتی، تو ایک آدمی ساتھ کر کے عطاءاللہ کو اُس کے گھر

(اوجھائی ضلع بدایوں) بھجوا دیتے، اور دونوں طرف کا کرایہ خود دیتے، اور عطاء اللہ سے کہتے کہ "جب اچھے ہوجاؤ، تو آجانا۔"

مولینا کے انتقال کے بعد عطاء اللہ اپنے وطن واپس جانے لگا۔ لیکن اپنے محترم والد کے اس دیرینہ ملازم کو مولینا کے فرزند مخدومی جناب خواجہ سجّاد حسین صاحب نے چھوڑنا نہ چاہا اور اس کے بعد وہ عرصہ تک خواجہ صاحب موصوف کے پاس رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹ مئی ۱۹۲۴ء کو آخری بار اپنے وطن گیا اور پھر نہ آیا۔ سُنا ہے کہ راستہ ہی میں کسی سٹیشن پر ریل سے اُترتے ہوئے گر پڑا اور مر گیا۔

چھوٹے بچوں پر نہایت شفقت فرماتے

مولینا کی عادت تھی کہ چھوٹے بچّوں پر نہایت شفقت فرماتے اور اُن سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آتے۔ تقاضائے عمر کے لحاظ سے خاندان کے

بچّے آپ کو خواہ کتنا ہی پریشان اور تنگ کرتے اور چاہے کتنا ہی مولینا کا وقت ضائع کرتے، مگر مولینا کبھی اُن سے نہ اُکتاتے اور اُن کے پریشان کرنے کی کوئی شکایت نہ کرتے

۱۔محمود علی کے متعلق | ایک خط میں جناب خواجہ سجّاد حسین صاحب کو لکھتے ہیں کہ "محمود اس وقت بہت تنگ کر رہا ہے اور خط نہیں لکھنے دیتا اس لیے خط کو ختم کرتا ہوں۔"

۲۔سیّدہ خاتون کے متعلق | آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب کی چھوٹی بچّی "سیّدہ خاتون" سے آپ کو بڑی محبّت تھی اور وُہ بھی بچپنے ہی میں اپنی پیاری پیاری باتوں سے مولانا کا دل لبھایا کرتی تھی۔ سیّدہ جب ڈھائی برس کی تھی تو مولینا نے اُس کے متعلق ایک بہت ہی دلچسپ نظم لکھی تھی۔ اِس نظم کے ایک ایک لفظ سے مولینا کی اُس محبت و شفقت کا اظہار ہوتا ہے، جو مولینا کو اس بچّی سے تھی۔ یہ دلچسپ نظم نہایت

کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ میں نے تلاش کر کے ۱۹۲۲ء میں "جواہراتِ حالی" میں شائع کی تھی، مگر "جواہراتِ حالی" بھی اب اس نظم کی طرح نایاب ہو گئی ہے۔ لہٰذا ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے میں یہ نظم یہاں نقل کرتا ہوں۔ اُمید ہے۔ کہ ناظرین کرام پڑھ کر نہایت محظوظ ہوں گے۔ نظم مذکور اپنی سلاست اور روانی کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہے اور مولٰینا کی بہترین نظموں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ بہر حال سُنیئے اور لطف اُٹھائیے۔ ؎

سیّدہ کیسی پیاری بچّی ہے — صُورت اچھی سمجھ بھی اچھی ہے
ذرا دیکھو تو اُس کی صُورت کو — سچّی چینی کی جیسی مورت ہو
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان — پر سب اچھے بُرے کی ہے پہچان
ماں نے جو کچھ اُسے سکھایا ہے — جو ادب قاعدہ بتایا ہے
وہ سبق سارے اُسکو ہیں ازبر — نقش ایک ایک بات ہے، دل پر

ہے ادب سے بڑوں کا لیتی نام — سب کو کرتی ہے ہاتھ اٹھا کے سلام

پھر ادب سے وہیں سلام کے ساتھ — پوچھتی ہے مزاج جوڑ کے ہاتھ

جھوٹ موٹ اس کو گر ڈراتے ہیں — بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں

بچپن سے یقیں نہیں کرتی — دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

وہ کسی بات پر مچلتی نہیں — اپنی عادت کبھی بدلتی نہیں

ایک بیماری سے تو ہے لاچار — ورنہ روتی نہیں کبھی زنہار

ایسی کم عمر، بے سمجھ ہو کر — دودھ بھی مانگتی نہیں رو کر

بے پیئے دودھ جب نہیں سرتی — ہے وہ ماں کی خوشامدیں کرتی

کبھی کہتی ہے پیار سے اماں — اور کبھی ڈالتی ہے گل بیاں

کوٹ کوٹ کر اس میں ہے بھری غیرت — اس کو کوئی جھڑک دے کیا طاقت

ماں نے جھولوں کبھی جو گھور دیا — اس نے بیچ مچ وہیں بسور دیا

ماں کی خفگی سے ہے بہت ڈرتی — اس کے تیور ہے دیکھتی رہتی

جب ذرا دیکھتی ہے چپ ماں کو — بار بار اس کو کہتی ہے "بولو"

ماں یہ سُن کر اگر ذرا ہنس دی | پھر کوئی دیکھے اس کی آکے خوشی

ہنستی ہے اور کھل کھلاتی ہے | بچّی پھُولی نہیں سماتی ہے

چاہنے والے اس کے ہیں جو جو | خوب پہچانتی ہے ایک اک کو

پھوپھیوں سے تو ہے لگاؤ بہت | گھر کا خالاؤں کے ہے چاؤ بہت

ہے چچاؤں کے نام کی عاشق | اُن کے کلمے کلام کی عاشق

غور سے اُن کا پڑھنا سنتی ہے | اور سُن سُن کے سر کو دُھنتی ہے

ختم ہو چکتے ہیں جب اُنکے بول | کہتی ہے بار بار "ابّا اوّل"

آرزو تو بہت ہے بولنے کی | پر نہیں اُٹھتی ہے زبان ابھی

یُوں تو تھی جب ہی پیاری اُسکی زبان | جبکہ کرنے لگی تھی وُہ غوں غاں

پھر تو آتا ہے اُس پہ اور بھی پیار | ہوتی جاتی ہے جس قدر ہوشیار

نہیں مُنہ سے نکلتے پُورے بول | بولتی ہے سدا ادھورے بول

لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب | زرگری اپنی بولتی ہے جب

نئے آتے ہیں گھر میں جب مہماں | دیکھ دیکھ اُن کو ہوتی ہے خنداں

پا کے بیٹھا اِدھر اُدھر سب کو دیکھتی ہے مڑ مڑ کر سب کو
اور پری شکل سے ہے گھبراتی ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی
ہیں جو ماں جائے بھائی اور بہن یوں تو سب کی اُسکے دل میں لگن
پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اُس کو کیونکہ اُوپر تلے کے ہیں دونوں
بس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا اور وہیں اُس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹتی ہے دوڑ کے ماں سے بھائی سے کہتی ہے "ہٹو یہاں سے"
عُمر اس کی خدا دراز کرے علم سے اس کو سرفراز کرے

چڑھیں ماں باپ کی سلامتی میں
سارے پروان بھائی اور بہنیں

ہمارا مقصد مندرجۂ بالا نظم پیش کرنے سے مولینا کی شاعرانہ خوبیاں ظاہر کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کے کلام کی تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ مگر ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ اُن کے کلام سے محبت و شفقت ٹپکی پڑتی ہے۔ ورڈس ورتھ نے

بھی دونوں نظمیں چھوٹی لڑکیوں پر لکھی ہیں اور چھوٹے بچوں کے خیالات ظاہر کرتے ہیں یہ شاعر انگلستان میں اپنا جواب نہیں رکھتا لیکن مولینا کی یہ مختصر نظم بھی ورڈس ورتھ کی نظم موسومہ بہ "ہم سات ہیں" سے کم دلچسپ نہیں ہے، اور جس طرح اُس نے واقعات کی ہوبہو تصویر کھینچی ہے، اُسی قدر بلکہ اُس سے زیادہ مولینا نے عمدہ پیرایہ میں اپنی نظم کو ادا کیا ہے۔ سادگی بیان، اصلی واقعات، اور سلاست زبان اِس نظم کی خصوصیات ہیں سخت افسوس ہے کہ سیّدہ خاتون کا ۴ سال کی عمر میں بمقام شملہ ۱۰ جون ۱۹۲۹ء کو انتقال ہو گیا، اور یہ ہونہار اور قابل بچّی پروان نہ چڑھ سکی۔

اُمرا کی خوشامد سے پرہیز کرتے مگر عوام کی حوصلہ افزائی بیحد کرتے

خوشامد، تملّق اور چاپلوسی جو امراء کی مدح میں لازمۂ شاعری سمجھی جاتی ہے اور مبالغہ کے بغیر والیانِ ملک اور مقتدر ہستیوں کی

تعریف ہمارے شعرا سے ہو ہی نہیں سکتی - مولانا ان "صفاتِ حسنہ" سے بالکل عاری اور تہی دست تھے - وہ اشخاص جن سے کبھی کسی فائدے کی امید اور کسی نفع کی توقع نہیں ہو سکتی تھی جب انھوں نے مولانا کے خیال میں ملک کی بھلائی اور قوم کی خدمت کا کوئی کام کیا، تو مولانا نے انتہائی حوصلہ افزا الفاظ میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اُن کی ایسی تعریف کی کہ اُن کو ہمیشہ کے لیے اُس پر ناز کرنے کا موقع ہاتھ آگیا -

مولوی ظفر علی خاں کی تعریف میں نظم

اِس کی مثال میں وہ قطعہ یادگار رہیگا جو عام رائے سے متاثر ہو کر حوصلہ افزائی کی خاطر مولانا نے مولوی ظفر علی خاں صاحب ایڈیٹر زمیندار لاہور کی تعریف میں رقم فرمایا تھا - یہ ۱۹۱۳ء کا زمانہ تھا - جبکہ مولوی ظفر علی خاں صاحب جنگِ بلقان کے سلسلہ میں قسطنطنیہ گئے تھے اور اُس وقت اُن کی اسلامی خدمات

اور قومی ہمدردی کا بڑا شور تھا، اور اسی ہام رائے کی ترجمانی مولینا نے اپنے ایک قطعہ میں کی ہے۔

برخلاف اس کے بلند مرتبہ حکام اور عالی قدر والیانِ ملک کی ستائش میں اوّل تو مولینا نے کبھی زبان کھولی ہی نہیں، لیکن جب کبھی اس قسم کی معزز ہستیوں کے متعلّق آپ نے کچھ لکھا ہے، تو ایسی سادگی اور واقعیت کے ساتھ کہ بمشکل بھی اُس پر تعریف و مدح کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مبالغہ اور خوشامد تو بڑی بات ہے۔

فرمانروائے دکن کا مدحیہ قصیدہ

وُہ فیض رساں دربار اور سرچشمۂ بزل وجود جس سے ہزاروں تشنہ کام سیراب ہو چکے اور فیض حاصل کر چکے ہیں اور جس عالی مرتبت حکمراں سے خود مولینا ایک سَو روپے ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔ اُس کی تعریف میں جو نظم آپ نے لکھی ہے، وُہ ہمارے دعوےٰ کا

روشن ثبوت ہے ۔ یہ نظم وہ قطعہ ہے جو اعلیٰحضرت حضور میر عثمان علی خاں والئ دکن کے جشنِ مسند نشینی کے موقع پر ستمبر ۱۹۱۱ء میں مولینا نے لکھی اور روزنامہ زمیندار لاہور میں شائع ہوئی ۔ یہ قطعہ اگرچہ ایک ایسے والئ ملک کی شان میں ہے ، جو علوم کا سرپرست اور علماء کا مربّی ہے جو ایک ایسی وسیع سلطنت کا حکمراں ہے ، جس کا رقبہ یورپ کی بعد آزاد حکومتوں سے بھی بڑا ہے ، جو نہایت شان اور دبدبہ کا حاکم ہے ۔ مگر مولینا اُس کے مدحیّہ قصیدے میں سوائے اس کے کہ اُس کو اس کی اہم ذمّہ داریاں کھول کھول کر بتائیں اور آخر میں چند دُعائیہ اشعار پر اپنے قصیدے کو ختم کر دیں اور کچھ نہیں لکھتے ۔

چونکہ بیان کردہ دونوں قطعے اس وقت نایاب ہیں اور عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے ۔ لہٰذا میں دونوں کو یہاں

نقل کرتا ہوں۔ جن سے علاوہ اس کے کہ میرے متذکرہ بالا الفاظ کی تصدیق ہو گی، یہ بھی ظاہر ہو گا کہ اظہارِ خیالات کا کس قدر بے نظیر ملکہ مولٰینا میں تھا اور مولٰینا کو قدرت نے موزوں، مناسب اور پُرزور و شاندار الفاظ کے استعمال پر کس قدر حیرت انگیز قدرت بخشی تھی۔ جو لوگ مولٰینا کے کلام کے شائق ہیں اُن کے لیے یہ دونوں نایاب قطعات ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوں گے۔ مَیں نے اِن دونوں کو مولٰینا کے غیر مطبوعہ کلام موسوم بہ "جواہراتِ حالی" میں نہایت تلاش و جستجو کے بعد درج کیا تھا۔ لیکن اب "جواہراتِ حالی" بھی اِن قطعات کی مانند نایاب ہو گئی ہے۔ اس لیے عام دلچسپی کی خاطر ان دونوں کا یہاں نقل کرنا غالباً ناموزوں نہ ہو گا۔

قطعہ در تہنیت مسند نشینی حضورِ نظام

فلک مرتبت میر عثمان علی خاں!
مبارک تمہیں مسندِ شہر یاری
مبارک اَب و جدّ کی تم کو خلافت
مبارک دکن کی تمہیں تاجداری
مبارک تمہیں ملک کی گلّہ بانی
مبارک رعیّت کی خدمت گزاری
مبارک ہو تم کو وُہ دشوار منزل
جہاں چپّے چپّے پہ ہے ذِمّہ داری
مبارک وُہ منصب کہ جن کو ملا وُہ
ہُوا چین رخصت فراغت سدھاری
مبارک بزرگوں کی میراث تم کو

جنھوں نے کہ جھیلی ہیں کٹھنائیاں ساری
ارادوں سے، جرأت سے ہمّت سے جنگی
زمانے نے ہے بار ہا شرط ہاری
تمہّوں سے ہے جن کی تاریخ رنگیں
زبانوں پہ ہے ذکرِ خیر اُن کا جاری
ادا کر گئے وہ تو اپنے فرائض
ہے اب آپ کے عہدِ دولت کی باری
اب اُن کی جگہ آپ کو ہے اُٹھانا
خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہیں دینا ہے اُن کو سہارا
جو بے یار ہیں اُن کی کرنی ہے یاری
نکمّے ہیں جو اُن کو کامی بنایا
بڑھانا دل اُن کا جو ہیں کاروباری

جگانا اُنہیں جو ہیں نیند کے ماتے
پڑھانا اُنہیں علم سے جو ہیں عاری
جو زردار ہیں اُن کی ہے پاسبانی
جو نادار ہیں اُن کی حاجت براری
جو سرزور ہیں اُن کی ہے گوشمالی
جو مظلوم ہیں اُن کی ہے غمگساری
بڑوں نے تھا عہدِ وفا جن سے باندھا
سدا کرنی اُس عہد کی پاسداری
سمجھنا ہر اِک قوم و ملّت کو یکساں
کہ خصلت ہے یہ زیورِ شہریاری
مبارک یہ بارِ گراں تم کو شاہا
اُٹھانے سے ہیں جس کے افلاک عاری
بہت مشکلوں کا ہے گو سامنا یہاں

کہ بہتوں نے یہاں آکے ہمّت ہے ہاری

مگر مشکلیں ہیں یہ سب اُن کو آساں

پڑی جن کی گھٹّی میں ہے ملک داری

پلے جو ہیں آغوش میں سلطنت کی

سیاست ہے جن کی رگ و پے میں ساری

یہ اُمّید ہے آصفِ ہفتمین سے

ریاست کی حل مشکلیں ہونگی ساری

رہے گا اسی طرح جیسے رہا ہے

دکن پر سدا سایۂ فضلِ باری

دُعا گو دیرینہ ناچیز حالی

کہ مدحت گری کے ہنر سے ہے عاری

دُعا کے سوا کچھ نہیں پاس اس کے

ادا جس سے ہو فرضِ مدحت نگاری

الٰہی طفیل اُس کا پھیلائی جس نے
خلائق میں توحید و پرہیزگاری
منادی نے تعلیم نے جس کی آکر
زمانے کی بگڑی ہوئی کل سنواری
طفیل اُس کا فرمانروائے دکن کی
حکومت کو دے غیب سے استواری
رہے رہتی دُنیا تلک وُہ سلامت
یہ اقبال و فیروزی و کامگاری

۲۔ قطعہ در تعریف مولوی ظفر علی خاں صاحب آف زمیندار

اَے مالکِ دفترِ زمیندار
اَے نازشِ قومِ فخرِ اقراں
اَے رُوح و روانِ جمع احباب

اَے چشم و چراغِ بزمِ اِخواں
اے دیں کے امتحاں میں جانباز
اَے نصرتِ حق میں تیغ عُمریاں
اَے صدقِ صفا کی زندہ تصویر
اَے شیرِ دِل، "اے ظفر علی خاں"!
قُدرت نے بھرے تھے تجھ میں جو گُن
جب تک وُہ رہے نظر سے پنہاں
فوقیت و برتری پہ تیری
قائم کوئی ہو سکی نہ بُرہاں
پر وقت کی تاک میں برابر
ہمّت تری گِن رہی تھی گھڑیاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ
اُٹھا سِتم و جفا کا طُوفاں

ہمدردیٔ اہلِ دیں سے نے آخر
جوہر ترے کر دیئے نمایاں
جمعیت و صبر کا سراسر
دامن ہُوا چاک تا گریباں
پھیلے وُہ بشکلِ سیلِ آتش
دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں
ڈالا یہ تری پکار نے غُل
جی اُٹھے وُہ مُردے جو تھے بیجاں
جو دل غمِ قوم سے تھے بےحِس
چلنے لگیں اُن دلوں پہ چھریاں
وُہ بن گئے آپ اپنے رہزن
جو مال کے اپنے تھے نگہباں
اسلام کی سمجھے اب حقیقت

جو نام کے تھے فقط مسلماں

ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ
سُنتا بھی ہے "اے ظفر علی خاں"!

نازاں ہے وُہ درس گاہ تجھ پر
تعلیم پہ جس کی، تو ہے نازاں

کاش آ بسے پھنے سدا وُہ فرزند
جو قوم کے درد کے ہوں درماں

سوزِ غمِ دینِ حق سے جن کے
سینے ہوں کباب، دل ہوں بریاں

جو ملک و وطن کے ہوں فدائی
جو قوم کے نام پر ہوں قُربان

مشرق میں ہوں وہ دردِ دل سے بیچین
مغرب میں سُنیں جو رنجِ اخواں

پنجاب کو تجھ پہ ہو اگر فخر
ہے اُس کو یہ فخر و ناز شایاں
زندہ ہے وُہ مُلک اور وُہ ملّت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

اصلاحِ خلق اور بنی نوع کی ہمدردی کا خاص جذبہ مولینا اپنے اندر رکھتے

حتی الامکان لوگوں کے اخلاق اور اعمال کی درستی کی کوشش کرتے

تھے۔ مولینا کے علم میں کوئی شخص غلط راستہ اختیار کر رہا ہو، یا ایسا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، جس کا نتیجہ مولینا کے خیال میں بُرا نکلے گا، تو مولینا اپنا فرض سمجھتے تھے کہ جہاں تک اپنے امکان میں ہو، اُسے وعظ و نصیحت کے ذریعے ملائمت اور نرمی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کریں۔

لوگوں کو سمجھانے کے مختلف طریقے

سمجھانے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ بعض اشخاص تو غلط کار لوگوں کو اِس طرح سمجھایا

کرتے ہیں کہ "کم بخت بیوقوف پاگل چھوڑ اس کام کو"۔ یہ نہایت درشتی اور بے وقوفی کا طرزِ عمل ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے طریق عمل سے کوئی ایک شخص بھی ہدایت نہیں پا سکتا۔ ۲۔ بعض لوگ ایسے خشک اور غیر مؤثر طریقے پر سمجھاتے ہیں کہ اُن کا سمجھانا کچھ کارگر ہو ہی نہیں سکتا اور ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ ۳۔ بعض سمجھاتے وقت اتنا خوف دلاتے ہیں کہ آدمی مارے خوف کے مر رہے، اگر بُرے کام کو چھوڑے بھی تو محض ڈر اور خوف کی وجہ سے۔ نہ کہ اس خیال سے کہ فی نفسہٖ یہ کام بُرا ہے اور بُرے کام کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ ۴۔ بعض لوگ نصیحت کرتے وقت اتنا لالچ دلاتے ہیں۔ کہ انسان محض آئندہ کے فائدے اور منافع کی توقع میں بادلِ ناخواستہ اُس کام سے باز آجاتا ہے، مگر جب اُسے کوئی اُمید اور توقع نہیں رہتی، تو پھر بدستور گناہ آلود

زندگی میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔

مولینا کا سمجھانے کا طریقہ اور اُس کا اثر

برخلاف اِن طریقوں کے سمجھانے کا طریق یہ تھا کہ ہمیشہ نرمی اور ملائمت کے ساتھ سمجھاتے تھے ۔ پھر سمجھانے کا طریقہ ایسا دل نشیں اور مؤثر ہوتا تھا کہ دل میں بیٹھتا چلا جاتا تھا ۔ مولینا کی عادت تھی کہ اپنی نصیحت میں نہ خوف دلاتے تھے نہ لالچ ۔ اُن کے وعظ میں نہ زبردستی کا مظاہرہ ہوتا تھا ۔ نہ جبر کی نمائش ، بلکہ وُہ جو کچھ کہتے تھے ، دلائل اور براہین کے ساتھ ۔ اور جس کو سمجھاتے تھے رفق اور نرمی کے ساتھ ۔ خشونت ، غصّہ اور غضب جو عام طور پر ناصحوں کے لیے لازمۂ زندگی سمجھا جاتا ہے ۔ مولینا کو چھو بھی نہیں گیا تھا ۔ لوگ مولینا کی باتوں کو ایک واعظ کی بڑ یا ایک ناصح کی خشک منطق نہیں سمجھتے تھے بلکہ یہ یقین کرتے تھے کہ ہمارا ایک نہایت شفیق اور مہربان بزرگ محض ہماری خیر خواہی اور ہمدردی

کے لیے ہمیں بُرے کام سے روک رہا ہے۔ نہ یہ کہ اپنی بزرگی اور وقار جتانا چاہتا ہے۔

مولینا کا ایک عجیب و غریب ناصحانہ خط

مثال کے طور پر میں یہاں ایک خط نقل کرتا ہوں، جو مولینا نے اپنے ایک عزیز کو اُس وقت لکھا تھا جبکہ وُہ عیسائی مذہب قبول کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔کہ سمجھانے اور نصیحت کرنے کی کتنی بے نظیر قابلیت قدرت نے مولینا کو عطا کی تھی اور وُہ اپنے مافی الضمیر کو کس خوش اسلوبی، کتنی عمدگی اور کس قدر خوبی کے ساتھ مخاطب پر ظاہر کر سکتے تھے اور اسی حیرت انگیز قابلیت کا نتیجہ تھا کہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص مولینا کی نصیحت سے انحراف کر سکتا تھا۔ چنانچہ مولینا کا وُہ عزیز بھی جو عیسائی ہونے کے لیے تیار تھا، مولینا کا خط پا کر اپنے ارادے سے رُک گیا۔ ہم اس نہایت

دلچسپ موثر اور عجیب و غریب تاریخی خط کو پورا کا پورا یہاں
درج کرتے ہیں کہ بہت سے متشکک مسلم نوجوان اس کے
مطالعہ سے سبق، عبرت اور نصیحت حاصل کریں۔

برخوردار سعادت اطوار سلمہ اللہ تعالیٰ!

بعد دعا کے مدعا یہ ہے کہ تمہارے کرنال چلے جانے
کے بعد تمہاری نسبت ایسی افواہیں سُنی گئی ہیں، جو
اوّل اوّل تو ہرگز باور نہ آتی تھیں، مگر اب روز بروز
اُن کا یقین ہوتا جاتا ہے اور نہایت اندیشہ ہے کہ تم
اپنی ناعاقبت اندیشی سے کوئی ایسا فعل نہ کر بیٹھو جس کا تمام
عمر پچتاوا رہے۔ اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑ کر جو
شخص دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے، اس کے کئی سبب
ہوتے ہیں۔ بعضے اپنے مذہب میں کچھ بُرائیاں پاتے ہیں
اور دوسرے مذہب میں اُن کو بہت سی خوبیاں معلوم ہوتی

ہیں اور اس سبب سے وہ اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔ بعضے[2] روپیہ پیسہ یا نوکری یا اور کسی لالچ سے اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذاہب میں شامل ہو جاتے ہیں بعض[3] اوقات صرف کسی کی ضد سے یا کسی کے چڑانے اور اور جلانے کو لوگ ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں۔ گویا دوسرے کی بدشگونی کے لیے اپنی ناک کاٹ ڈالتے ہیں معلوم نہیں تم نے ایسا ارادہ کس وجہ سے کیا ہے۔ اگر بالفرض تم نے اسلام میں کوئی نقص یا عیب معلوم کیا ہے اور عیسائی مذہب کو تمام مذہبوں سے بہتر پایا ہے، اور مذہبی تحقیقات کے جتنے مراتب ہیں، وہ سب طے کر لئے ہیں اور بالکل تمہارے دل میں شبہ و شک باقی نہیں رہا، تو بھی تم کو اپنا مذہب چھوڑنے اور دوسرا مذہب اختیار کرنے میں ایسی جلدی نہیں کرنی چاہیے حالانکہ میں جہانتک خیال کرتا ہوں، تم نے مذہبی تحقیقات

کی الف بے تے بھی ابھی نہیں پڑھی۔ اور میرے نزدیک
تم ہرگز عیسائی مذہب اختیار نہیں کرتے کہ تم نے اسلام کو
بُرا مذہب اور عیسائیت کو اچھا یقین کرلیا ہے۔ بلکہ میرے
نزدیک تم کو انگریزی تعلیم کا شوق ہے اور اس کے حاصل
کرنے کا مقدور نہیں ہے۔ اس لیے تم نے یہ ذلیل اور نامرانہ
تدبیر سوچی ہے کہ اس طرح پر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا
موقع ملیگا۔ انگریزی تعلیم کی اس زمانے میں بیشک بہت
ضرورت ہے۔ مگر نہ ایسی کہ مذہب اور دین جیسی عزیز چیز کو
اُس پر قربان کردیا جائے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ عیسائی
مذہب اختیار کرنے سے انگریزوں کی نظر میں تمہاری عزّت
زیادہ ہوجائیگی۔ یہ خوب یاد رکھو کہ نیٹوز کی اگر تھوڑی
بہت عزّت انگریزوں کے نزدیک ہے بھی تو عیسائی ہونے
کے بعد اُن کی اتنی عزّت بھی انگریزوں کی نظر میں باقی نہیں
رہتی۔ وُہ کسی نیٹو کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اُس نے مذہبی
تحقیقات کرکے عیسائی مذہب اختیار کیا ہوگا۔ بلکہ اُن کو
یقین ہوتا ہے کہ محض لالچ اور طمع سے اُس نے اپنا مذہب

تبدیل کیا ہے اور اس لیے وہ اُس کو حلال خور اور چمار سے بھی زیادہ ذلیل جانتے ہیں۔ بیشک چند پادری اس خیال سے کہ شکار جال میں پھنسا ہوا کہیں نکل نہ جائے اور مشن میں اُن کی کچھ کارگزاری ثابت نہ ہو بظاہر ایک نیٹو کرسچین کی خاطر کرتے ہیں مگر دل میں وہ بھی اُس کو چمار اور حلال خور سے بہتر نہیں سمجھتے۔ اے میرے عزیز کیا تم یہ جانتے ہو کہ انگریزی تعلیم جو عیسائی مذہب اختیار کر کے تم حاصل کرنا چاہتے ہو اس سے اب یا آئندہ تمہاری خوشی اور عزّت زیادہ ہو جائیگی۔ یقین جانو کہ خدانخواستہ اگر یہ حرکت تم کر بیٹھے تو تم کو زندگی کاٹنی دشوار ہو جائیگی۔ نہ اپنی قوم میں تمہاری عزّت باقی رہے گی اور نہ وہ قوم جس کا مذہب اختیار کروگے تم کو عزّت کی نظر سے دیکھے گی۔ افسوس ہے کہ تم عیسائی مذہب کی حقیقت سے بالکل ناواقف ہو، اس لیے تم نے ایسا ارادہ کیا ہے۔ شاید تم کو معلوم ہوگا کہ تمام یورپ اور امریکہ میں روز بروز بے دینی اور الحاد پھیلتا جا رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عیسائی مذہب جو ان ملکوں میں جاری ہے جُوں جُوں وہاں تعلیم پھیلتی جاتی ہے، اُن کی کمزوری اور بودا پن

لوگوں پر ظاہر ہوتا جاتا ہے۔ تثلیث اور کفّارہ کے مسئلہ کو
کوئی تعلیم یافتہ ایک منٹ کے لیے بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔
اوّل اوّل ابتدائے عملداری انگریزی میں بعض بعض اشخاص
نے جو قوم کے شریف تھے۔ عیسائی مذہب اختیار کیا تھا۔
لیکن جب سے ہندوستان میں تعلیم پھیلی ہے، چماروں کے
سوا یا قحط زدہ بچّوں کے سوا کوئی شریف اور عاقل اور
تعلیم یافتہ آدمی اس مذہب کو اختیار نہیں کرتا۔ ہمارے
وطن میں مُلّا سراج الدین اور اُس کے بیٹے خیر الدین نے
عیسائی مذہب اختیار کیا تھا۔ مگر دونوں نے نہایت نادم
اور پشیمان اور تمام شہر میں بدنام ہو کر پھر آخر کو اسلام اختیار
کیا۔ اگرچہ وُہ اسلام کی حالت میں مرے، مگر شہر میں لوگوں
کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ خیر الدین کا چھوٹا
بھائی عماد الدین ابھی تک عیسائی ہے۔ اتفاق سے وُہ
عربی پڑھا ہُوا تھا، اُس کو مشن میں معقول نوکری مل گئی،
اور گھر پر روٹی کا ٹھکانا نہ تھا، اس سبب سے ٹھہرا رہا، مگر
اپنے ملک و قوم میں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ یخدا میں تم کو

یہ باتیں اس خیال سے نہیں لکھتا کہ مَیں مسلمان ہوں، بلکہ صرف
اس لیے لکھتا ہوں کہ اگر تم یہ حرکت کر بیٹھے، تو تمہاری زندگی
تلخ ہو جائیگی اور حد سے زیادہ پچتاؤ گے اور اگر پھر اپنے مذہب
میں آ بھی گئے، تو ہمیشہ لوگوں کی نظروں میں حقیر رہو گے۔
دُوسرا مذہب اختیار کرنے کی معقول صورت صرف یہی نظر
آتی ہے کہ آدمی نہایت سچے دل سے ہر ایک مذہب کی تحقیقات
کرے اور جب اُس کا دل بالکل کسی خاص مذہب پر مطمئن ہو
جائے، تو اُس کو اختیار کر لے۔ لیکن میں نہیں خیال کر سکتا کہ تم نے
آج تک اپنے مذہب کی بھی تحقیقات کی ہے یا نہیں۔ چہ
جائیکہ دُوسرے مذہبوں کی تحقیقات، جس کے لیے کم از کم چالیس
یا پچاس سال کی عمر درکار ہے۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ انگریزی
تعلیم کیونکر حاصل کروں؟ ماں باپ مدد نہیں کرتے، اس کا
جواب یہ ہے کہ مَیں بیسیوں مثالیں ایسی دے سکتا ہوں کہ نہایت مفلس
اور بے مقدور لڑکوں نے جن کو بڑی عمر میں تعلیم کا شوق پیدا
ہُوا اوّل نوکری کی اور تنخواہ میں سے جو بچت ہُوئی اُس کو جمع
کرتے رہے، پھر جب معقول رقم جمع ہو گئی، تو نوکری چھوڑ کر

مدرسہ میں داخل ہوئے اور اپنی تعلیم پوری کی بعضوں نے ساہوکاروں کو تمسک لکھ دیے کہ ہم تعلیم پانے کے بعد جب نوکر ہو جائیں گے تو تمہارا قرضہ مع سود ادا کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ مردانگی ہمت اور شرافت کی یہ باتیں ہیں یا یہ کہ "اگر تعلیم کا خرچ نہیں دیتے، تو عیسائی ہوتا ہوں"۔ کیوں شرافت اور سیادت کے نام کو دھبہ لگاتے ہو؟ کیوں دادا پردادا اور اپنے جدِ امجد کی روح پر فتوح کو تکلیف دیتے ہو؟ کیوں اپنی زندگی تلخ کرتے ہو؟ اور کیوں اپنی حماقت اور بے وقوفی تمام عالم پر ظاہر کرتے ہو؟ اگر فی الواقع تم کو دینِ اسلام میں کچھ شبہات ہیں، تو ایک آدھ روز کے لیے یہاں ہو جاؤ اور اپنے شبہات بیان کرو۔ اگر کوئی اُن کا معقول جواب نہ دے سکے، تو پھر تم کو اختیار ہے۔ چاہو، مزید تحقیقات کرنا، چاہو ترکِ مذہب کرنا۔ یہ چند سطریں صرف تمہاری خیر خواہی کے لیے لکھی ہیں، ان کو غور سے اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اور نفسانیت اور غصہ اور ضد کو دل سے نکال کر پڑھو اور پھر جو تمہارا جی چاہے سو کرو۔

الطاف حسین از پانی پت ۱۲ فروری ۱۸۹۷ء

خاتمہ

مولینا کے اخلاق و عادات کے متعلق اگرچہ ابھی میرے پاس اور بھی بہت کچھ مواد موجود ہے اور بہت سی یادداشتیں مَیں نے لکھ رکھی ہیں۔ نیز متعدد حیرت انگیز واقعات میرے حافظہ میں محفوظ ہیں، مگر چونکہ اس مختصر تصنیف کو بہت ہی جلد شائع کرنا ہے اور اب وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ نہیں رہا اور اُن واقعات و حالات کی جمع و تدوین میں کافی وقت کی ضرورت ہے۔ اس لیے مجبوراً میں اس وقت مولانا کے اخلاق و عادات کے متعلق مندرجہ بالا مختصر بیان پر ہی قناعت کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا اور کبھی مولانا کی مکمل و مفصل سوانحعمری لکھنے کی توفیق ملی، تو اُس وقت باقیماندہ تمام واقعات تفصیل کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر سکوں گا اور اِس عرصہ میں جو اور حالات معلوم ہونگے وہ بھی شامل کر دیے جائیں گے۔ خداوند کریم کے حضور دعا ہے کہ میرے ارادہ کو عملی شکل میں تبدیل فرمائے اور میرے ادھورے کام کو تکمیل تک پہنچائے۔ آمین

خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی

پانی پت۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء

کتبہ محمد بشیر الفضل دولتابادی

شیخ محمد اسماعیل پبلشر نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر پانی پت سے شائع کیا۔